ترقی پسند تحریک کی مجلّاتی صحافت: ایک جائزہ (۱۹۳۶ء تا ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر حمیرا اشفاق، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

The study deals with official urdu journals of progressive writers association (PWA) have been appeared since 1936, the year when PWA was established. The journals which started before partition and continued till post-independant years continued, were adab-e lateef "savera' (Lahore) and 'Naya Adab(Mumbai).The analyses reflect the various trends and themes of progressive Urdu litrrature from Peshawar to Mumbai.It also reflects the voices of descent with in the movement.Adab-E-Lateef and 'Savera' fell in serious and conflicting ideological debated during early 1950s.

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کو پچھتر برس گزر چکے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کا پون صدی کا یہ سفر کئی پہلوؤں سے اہم اور قابل توجہ ہے۔ اس موضوع پر درجن بھر سے زائد کتابیں سامنے آ چکی ہیں اور ان میں تحریک کے مختلف حوالوں سے سوالات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ پر مبنی درجنوں کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن لحہ بہ لحہ تاریخ رقم کرنے والے ادبی مجلّوں کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ افتتاح ہوا تو بعض اخبارات کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والا جریدہ''ادب لطیف'' موجود تو تھا لیکن اسے انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ جڑنے میں تھوڑا وقت لگا۔ لیکن جب ایک بار اس نے ترقی پسند ادب کی ڈگر اپنالی تو پھر یہ انجمن کا باضابطہ ترجمان بن گیا اور اس راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ترقی پسند ادب کے لیے''ادب لطیف'' اور اس کے بعد نکلنے والے رسائل و جرائد کا تفصیلی ذکر تو آگے چل کر آئے گا لیکن یہاں یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ ان ادبی جرائد کی ترقی پسندی کو آخر موضوع کیوں نہ بنایا گیا؟ اس بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مختلف ادوار میں نکلنے والے پرچوں اور ان کے دورانیے کا مختصراً جائزہ لیں۔ ہم نے'ادب لطیف' کا ذکر کیا ہے، جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل سے بھی ایک

سال قبل ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا۔ اور ۱۹۳۶ء سے ہی اس میں شائع ہونے والی اکثر تخلیقات ترقی پسند رجحانات کو ظاہر کرنے لگیں۔ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا اور ۴۰۔۱۹۳۹ء کے سالنامے میں کہا گیا: ''زیرِ نظر سالنامے کا بیشتر حصہ ان مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے، جو ترقی پسندانہ رجحانات لیے ہوئے ہیں۔'' (۱)

یہ پرچہ میرزا ادیب کی ادارت میں ۱۹۴۱ء تک کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۹ء تک فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی اور عارف عبدالمتین مختصر وقفوں کے دوران ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ یہ عظیم تبدیلیوں کا دور تھا۔ 'ادبِ لطیف' اب تک ترقی پسند ادب کے سیاسی پہلوؤں سے الگ تھلگ رہا تھا۔ جبکہ کوئی دوسرا مجلّہ ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب انجمن کا قیام عمل میں آیا اس وقت کمیونسٹ پارٹی سختیوں اور پابندیوں کے دور سے گزر رہی تھی۔ سپین کی خانہ جنگی ۳۹۔۱۹۳۶ء کے دوران ہسپانوی، جمہوریہ کو بچانے کے لیے ادیبوں نے قلم چھوڑ کر بندوق اٹھالی تھی۔ بین الاقوامی ادیبوں کے اس امن بریگیڈ نے ہندوستانی ادیبوں پر بھی انتہائی گہرے اثرات کیے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اُردو کے ترقی پسند اہلِ قلم نے سوویت یونین کی ہمنوائی میں اسے سامراجی جنگ قرار دیا لیکن جب ۱۹۴۱ء میں ہٹلر کے جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کردیا تو سوویت یونین کو اپنے دفاع میں فاشزم کے خلاف عالمی اتحاد کا حصہ بننا پڑا۔ اس کے ہندوستان پر بھی دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اسے عوامی جنگ قرار دیا۔ پارٹی پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور یوں ترقی پسندوں کو پہلی بار کھل کر اپنی سرگرمیوں کے اظہار کا موقع ملا۔ ''سنگِ میل'' کا یہ دور فیض، بیدی اور فکر تونسوی جیسے ترقی پسند ادیبوں کی ادارت کا دور ہے۔ فروری ۱۹۴۲ء کے اداریے میں صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے فیض نے کہا:

> ''آج سے بہت عرصہ پہلے جب سماج ایک معین اور یکساں نظام کے ماتحت تھی۔ اس کا ادب بھی ایک ٹھہرے ہوئے دریا کی کیفیت رکھتا تھا۔ جس کے موضوعات اور اسالیب چند بندھے ہوئے قوانین کی پیروی کرتے تھے۔ سماج کا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا اور نیا نظام شرمندۂ تشکیل ہونے سے پہلے آمادہ زوال نظر آتا ہے۔ یہی تزلزل اور بے یقینی جو ہمارے خارجی ماحول میں ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے افکار و اشعار پر بھی مسلط ہے۔ ان میں پرانے نظامِ اخلاق و معاشرت کے نام لیوا بھی ہیں۔ نئی اقدار کے ترجمان بھی، قنوطی اور فراری بھی ہیں۔ خود اعتماد اور حقیقت پسند بھی، رجعت پسند بھی ہیں ترقی پسند بھی، ہمارے تنقیدی نظریے بھی انہیں متناطیس رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر ایک نقاد کی نظر میں ادب کا مقصد محض تفریحی ہے تو دوسرے کے خیال میں ادب کی افادی مقاصد سے علیحدہ کرنا ناپسندیدہ بھی ہے اور غلط بھی۔ لیکن یہ مختلف اور متناقص رجحانات یکساں طور پر اہم اور توانا

نہیں ہیں، یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ ان میں سے کون شباب کے پہلے مرحلہ میں ہے اور کون پیری کی آخری منزل میں ایک ادبی ماہانہ جو آزادی گفتار کا قائل ہے اپنے جریم کا دروازہ سب پر کھلا رکھتا ہے۔ زائرین کی تعداد اور ان کی حرکات خود اس بات کی شاہد ہیں کہ وقت اور ہجوم کا رخ کس طرف ہے۔ ادب لطیف میں بھی ہم حسب وسعت ہمعصر ادب کی مجموعی شکل وصورت پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور اگر یہ صورت بعض اصحاب کی نظر میں پسندیدہ نہیں تو ہمیں ان سے ہمدردی ہے وہ یا اپنے وقت سے بہت پیچھے ہیں یا بہت آگے وہ ادب لطیف یا موجودہ دور کے کسی اور نمائندہ مجلّہ سے برسر پیکار نہیں اپنے ماحول سے جنگ میں مصروف ہیں۔'' (۲)

اس عصری تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند تحریک کے آغاز کو حالی اور آزاد کے بعد کی دوسری بغاوت قرار دیا اور انہوں نے لکھا:

''آج سے قریباً سات برس پہلے چند نوجوان ادیبوں نے ترقی پسند کے عنوان سے ایک تحریک شروع کی جس کا بنیادی مقصد ادب کو مروجہ رومانیت اور خیال پرستی کے بجائے زندگی اور واقعیت کی طرف مائل کرنا تھا۔ حالی اور آزادی کے زمانہ کے بعد ادب کی مروجہ رسوم کے خلاف یہ دوسری اہم بغاوت ہے۔ اس کی توانائی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اس مختصر سے عرصہ میں یہ تحریک ہماری ادب کے قریباً ہر شعبہ کا مستقل جزو بن چکی ہے اور دوسرا ثبوت یہ کہ آج تک ہمارے ادب میں غالباً کسی نظریے، کسی مصنف اور کسی تحریک کی اس شدت سے حمایت کا مخالفت نہیں ہوئی۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ کچھ دنوں موضوع بحث رہا فریقین نے اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور معاملہ طے ہو نہ ہو ختم ضرور ہو گیا لیکن ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا مسئلہ ایک مسلسل آویزش کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ایسے بنیادی مسئلے کے متعلق ایسا ہونا بھی چاہیے۔'' (۳)

یہ اور اس طرح کے مباحث اگلے چند برسوں تک جاری رہے۔ 'ادب لطیف' ۱۹۴۵ء کے سالنامہ میں 'معروضات' کے عنوان سے کرشن چندر کا تفصیلی مضمون شائع ہوا جو دراصل ان کی مرتبہ کتاب ''نئے زاویے'' جلد دوم کا دیباچہ تھا۔ اس سے بحث کے نئے در وا ہوئے۔

اس دیباچے میں انہوں نے سامراجی جنگ سے عوامی جنگ کے آخری مراحل اور دیگر سماجی شعبوں سے کھل کر بحث کی۔ نئے جنسی ادب پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور ترقی پسند ادب کا زبان، تاریخ، سائنس جغرافیہ اور معاشیات کے حوالے سے جو مخصوص نقطۂ نگاہ ہے، اس پر کئی سوالات سامنے آئے۔ اس سوال پر بھی بحث کی گئی کہ ادب میں مزدوروں اور کسانوں کی ترجمانی کے لیے کیا کسی مزدور کسان ادیب کو ہی آنا پڑے گا؟ کرشن

چندر نے نتیجہ اخذ کیا کہ ''نئے ادب میں بلاشبہ طربیہ عناصر کی کمی ہے، اس کی شاعری نشاطیہ نہیں، اس کے نثری کارنامے مسرت آگیں نہیں بلکہ ایک مغموم تابندگی کے مظہر ہیں۔۔۔لیکن اگر آپ نئے ادب کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ آنکھ محض یاس و نکبت کے مناظر نہیں دیکھتی بلکہ ان تاریک گھٹاؤں کے پرے اُفق پر اس چاندی کی لکیر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لیے ایک نئی راہ ہے۔'' (۴) یہ امید، یہ رجائیت ایک نئی جدوجہد، ایک نئے طرزِ عمل کی طرف اشارہ تھی۔ اسی شمارے میں مسعود زاہدی نے ''ترقی پسند ادب'' کے عنوان سے یہ کہنے کی کوشش کی کہ ''ترقی پسند ادیب کا مقصد اولیٰ لسانی انقلاب پیدا کرنا ہے جو حکومتی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکے گا۔ ترقی پسند ادب کا جو ہر عام انسانی مسرت کے حصول کی جدوجہد ہے۔'' (۵) یہ ادیب سماجی اور نفسیاتی آزادی کا نقیب ہے۔ یہ مصنوعی اور جھوٹی قدروں کو رد کرتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں، جب ''ادب لطیف'' کی عمر دس برس ہو رہی تھی، بمبئی (موجودہ ممبئی) سے دو ماہی ''نیا ادب'' کا اجراء ہوا جسے ترتیب دینے والوں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام شامل تھے۔ قلمی معاونین میں سجاد ظہیر، سبط حسن، ساحر، ظہیر کاشمیری، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر، ہنس راج رہبر، اوپندر ناتھ اشک، سید ممتاز حسین، حبیب تنویر، فارغ بخاری، فکر تونسوی، راجندر سنگھ بیدی، جوش، احمد ریاض، شاکر علی، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی سمیت درجنوں نام شامل تھے۔ ۴۸۔۱۹۴۵ء کے درمیانی برسوں میں کیفی اعظمی کا ''ترقی پسند ادب کیا نہیں ہے؟'' شاکر علی کا ''سوویت آرٹ اور مصور'' سجاد ظہیر کا ''اردو، ہندی اور ہندوستانی'' کرشن چندر کا ''نئی قدریں'' اور ممتاز حسین کا ''ادبی قدریں کیا ہیں؟'' جیسے بنیادی نوعیت نظریاتی مقالات شائع ہوئے۔ بمبئی انجمن جمہوریت پسند مصنفین کا ہیڈکوارٹر تھا۔ یہاں درجنوں ادیب اور شاعر جمع ہو گئے۔

''نیا ادب'' کا اداریہ ''حرف آغاز'' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا جو چاروں مدیران کی اجتماعی کاوش ہوتا۔ ان شماروں میں ترقی پسند شعر و افسانہ نے بھی خوب جگہ بنائی۔ اس کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا ''ترقی پسند مصنفین کی دو ماہی کتاب''۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ ماہنامہ بن گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اپنے آغاز سے ہی ''نیا ادب'' نے علی الاعلان ترقی پسند تحریک کی تائید و ترویج کا بیڑہ اٹھایا۔ دوسرے شمارے کے اداریے میں مدیران نے اپنی جانبداری کا اعلان کر دیا۔ ان کے بقول:

> ''انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۳۶ میں پڑی اور مخالفت بھی اسی وقت سے شروع ہوئی جو پچھلے تین چار سال میں جنون سے بدل گئی۔ مخالفین کا پراپیگنڈہ یہ بھی تھا کہ یہ تحریک ''چند مغرب زدہ ناتراشیدہ لونڈوں'' کی تحریک ہے، لیکن کانفرنس میں شریک تھے، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تارا چند، سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، مولوی علی اختر، ڈاکٹر زور، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، مولوی اکبر وفا قانی، ملک راج

آنند، مدن گوپال اور سجاد ظہیر وغیرہ۔''(۵)

'حرف آغاز' ہی کے مطابق اسی سال ۱۴ سے ۱۷/اکتوبر ۱۹۴۵ء تک، حیدر آباد دکن میں اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کی مختصر روداد اداریے میں شامل کی گئی ہے۔ جس کے مطابق کرشن چندر، سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، سبط حسن، سردار جعفری اور ساحر لدھیانی نے پُرمغز مقالے پیش کیے۔ یہ مقالے ادب، آرٹ، اُردو شاعری، اُردو صحافت، اقبال اور جنگ اور نظم کے موضوعات کا احاطہ کرتے تھے اور الگ الگ موضوعات ہونے کے باوجود ان میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ اپنے کلچر اور ادب کے تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش تھی۔ مختلف قراردادوں کے ذریعے انجمن میں دیگر فنون سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کی شرکت، فلم اور صحافت کی اصلاح اور سال کی بہترین تصنیف پر ساڑھے تین سو روپئے کا غالب انعام دینے کا اعلان کیا گیا:

> ''یہ تجویزیں اس تغیر و انقلاب کا اظہار ہیں آج دنیا جن سے گزر رہی ہے۔ اس عہد شکست و ریخت میں ہر ایسی چیز فنا ہوجائے گی، جس میں بدلنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ادب، آرٹ، فلم اور صحافت کو زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے تو ان کو نئے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا۔''(۶)

۱۹۴۶ء میں ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بنگال، بہار، یوپی اور بمبئی بری طرح ان کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب تک جو ہندو اور مسلمان انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، وہ خونی ہتھیاروں کے ساتھ، ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اگر ایک طرف غنڈہ اور بدترین سماجی عناصر چاروں طرف آگ لگا رہے تھے تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے، جو انسانی محبت اور بھائی چارے کی حفاظت کررہے تھے۔ اخبارات میں سیاسی جماعتیں، ایک دوسرے پر الزام لگارہی اور اس آگ کو مزید بھڑکا رہی تھیں۔۔ اس موقع پر دوماہی ''نیا ادب'' نے جو اداریہ لکھا، اس پر چاروں مرتبین۔۔ کرشن چندر، احمد عباس، کیفی اعظمی اور سردار جعفری۔۔ نے اپنے دستخط کیے۔ اداریہ میں کہا گیا کہ:

''اس خانہ جنگی کی آگ میں وہ بہترین قدریں جل کر خاک ہورہی ہیں جن پر تہذیب، تمدن، ادب اور فن کی بنیادیں قائم ہیں۔ عورتیں نرم دل سمجھی جاتی ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں لیکن اب کی بار برادر کشی میں انہوں نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس فساد میں جو روح فرسا اور ہولناک مناظر دیکھے گئے ہیں۔ ان کی مثال ذرا شکل سے ملے گی۔ لاشوں کی نمائش کی گئی۔ کٹے ہوئے سر جلوس کے ساتھ نیزوں اور تلواروں پر بلند کیے گئے۔ بچوں کی نعشوں کو کیلوں سے ٹھوک کر عبرت کے لیے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ہندو اور مسلم اخبارات اور سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو الزام دیتی رہیں۔ اگر باہمی نفرت کی اس آگ کو فوراً نہ بجھایا گیا تو ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کوئی اچھا سرمایہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہندوستان، گوتم بدھ اور نانک کا ہندوستان،

کالیداس ٹیگور اور اقبال کا ہندوستان، ٹیپو اور بھگت سنگھ کا ہندوستان، شبلی اور محمد علی کا ہندوستان، خاکستر کا ایک ڈھیر ہوگا۔''(۷)

اس موقع پر ہندوستان بھر کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے دستخطوں سے ایک طویل بیان جاری کیا۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں اُردو، سندھی، پنجابی، بنگالی، گجراتی، ہندی اور ہندوستان کی دیگر کئی زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ سید سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اسرار الحق مجاز، اوپندر ناتھ اشک، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، علی سردار جعفری، ابراہیم جلیس، قدوس صہبائی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، رام بلاس شرما، رمیش سنہا، بھوگی لال گاندھی، بشنو ڈے، میلا جانند مکرجی اور مانک بینرجی سمیت درجنوں ترقی پسند ادیبوں نے اس بیان پر دستخط کیے یہ بیان تاریخ اہمیت کی حامل ایک دستاویز ہے۔ درج ذیل اقتباس سے بیان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس نازک دور میں فرقہ پرستی اور اس کے تمام مظاہر کے خلاف جہاد کریں اور کوشش کریں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخیاں نہ پیدا ہونے پائیں اور ہندوستانیوں کی باہمی کشیدگی اور زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ ہم اس فرض کو صرف اس طرح انجام نہیں دے سکتے کہ اپنے اہل وطن سے انسانیت اور حب الوطنی کے نام پر اپیل کریں اور سامراج کی مہلک سیاست کا پردہ چاک کریں بلکہ ہم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ عوام کی مشترکہ جدوجہد اور زندگی سے اتحاد، محبت اور بھائی چارج کی بہترین مثالوں کو ادبی اور فنی شاہ پاروں کی شکل میں پیش کریں۔ ہم نے کلکتے اور بمبئی میں یہ دیکھا ہے کہ منظّم مزدور طبقہ نہ محض فرقہ وارانہ فساد اور قتل و غارت کے شعلوں سے بچا رہا بلکہ ہندو اور مسلم مزدوروں نے مل کر ان قوم دشمن عناصر کے خلاف عملی جدوجہد کی جن کا ضمیر مر چکا تھا اور جن کی انسانیت اور حب الوطنی کے جذبات سڑ چکے تھے۔ ایسی مثالیں درمیانی طبقے میں بھی نظر آتی ہیں کہ انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے بھائیوں کی حفاظت کی اور اس طرح اتحاد کے جذبے کو تقویت پہنچائی۔ ہمیں یقین ہے کہ سامراج کی تمام اشتعال انگیزی اور قومی رہنماؤں کی ساری ناکارہ سیاست کے باوجود باہمی نفرت، نفاق، فساد اور خانہ جنگی کے شعلے، عوام کی باہمی محبت، اتحاد اور حب الوطنی کے بڑھتے ہوئے دھارے سے بجھ جائیں گے۔ موت اور غلامی کو شکست ہوگی اور زندگی اور آزادی کو فتح نصیب ہوگی۔''(۸)

۱۹۴۶ء میں ہی ترقی پسند ادب کا ایک اور ترجمان ''سویرا'' لاہور سے جاری ہوا۔ اس کی پیشانی پر درج تھا۔ ''جدید فن کاروں کے خیالات کا سلسلہ'' اور مدیران میں احمد ندیم قاسمی، نذیر چودھری اور فکر تونسوی

کے نام تھے۔۔ نذیر چودھری اب چودھری برکت علی کے ساتھ ''ادب لطیف '' چلا رہے تھے لیکن بعض اختلافات کی بنیاد پر وہ مکتبہء اُردو اور ''ادب لطیف '' سے الگ ہوگئے اور ''نیا ادارہ'' کے زیر اہتمام ''سویرا'' کا اجراء کیا۔ چودھری نذیر 'ادب لطیف ' سے کیوں الگ ہوئے، کیا یہ کاروباری اختلاف تھا یا اس کی بنیاد نظریاتی تھی؟ انور سدید نے عارف عبدالمتین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ''ادب لطیف '' کی بلند اور مضبوط عمارت میں چند رخنے پیدا ہوگئے جو داخلی نوعیت کے تھے چنانچہ ''ادب لطیف '' کے انتظامی معاون چودھری نذیر احمد اور ادارتی معاونین قتیل شفائی اور فکر تونسوی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ (۹) اس بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ داخلی نوعیت کے وہ رخنے کیا تھے۔

چودھری نذیر احمد کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ چوہدری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کے اختلافات نظریاتی تھے۔ ادب لطیف کی نظریاتی سمت واضح طور پر ترقی پسندوں کی جانب تھی۔ اس لیے حکومت کے دباؤ کی تلوار ہر وقت لٹکتی رہتی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں میرزا ادیب کے دورِ ادارت میں دو ہزار روپے کی زرِضمانت بھی جمع کرانی پڑی تھی حالانکہ میرزا ادیب خاصے معتدل مدیر تھے اور انہوں نے اپنے اداریے میں واضح بھی کیا تھا کہ 'ادب لطیف' خالص ادبی رسالہ ہے اور اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن ۱۹۴۶ء میں فکر تونسوی جیسے نظریاتی مدیر کی موجودگی مجلّہ کی بقا کے لیے خطرہ بنتی جارہی تھی۔ چودھری نذیر احمد نے ۱۹۴۶ء میں جب سویرا کا اجراء کیا تو مدیران کی بات چیت (اداریہ) کے بعد ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے دوٹوک لفظوں میں کہا:

''ادب لطیف '' کو میں نے رگ جاں سمجھ رکھا تھا اور اس کے لیے فن اور ادب کی نت نئی دنیائیں نت نئے چراغ اور نت نئی منزلیں پیدا کرتا، روشن کرتا اور طے کرتا چلا گیا۔ ہماری دن رات کی تعمیری کوششوں اور ترقی پسند ادیب ساتھیوں کی معاونت سے ادب لطیف کی مشعل روشن سے سے روشن تر ہوتی چلی گئی۔ قانون کی خداوندانہ گرفتیں، ادب کے رجعتی نمائندوں کا طوفان مخالفت اور اپنے سرمایہ دار شریک کار کا مسلسل عدم تعاون۔۔ سبھی کچھ برداشت کیا۔ لیکن اگر برداشت نہ ہوسکا تو صرف دو وقت، جب میرے شریک کار نے میرے بڑھتے ہوئے نظریاتی حوصلوں میں سدراہ بننے کی کوشش کی اور میرے سامنے اپنے آمرانہ مطالبے پیش کیے کہ یا تو اس رسالے کی ادبی پالیسی بدل دو یا اس سے الگ ہوجاؤ۔ میرے دوست میرے اس وقت کے تذبذب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب ایک طرف تو میرا بنیادی نصب العین تھا اور دوسری طرف اپنی ''رگ جاں'' کی مفارقت لیکن میں نے جی کڑا کر کے اپنے نصب العین پر اپنے ادب لطیف کو قربان کردیا۔ یہ قربانی، تاریخی قربانی ہے تاریخ جو ارتقائی منازل کو آئینہ دکھاتی ہے۔

> ''سویرا''۔۔۔۔ میری نئی رگ جاں ہے اور میں ملک بھر کے ادب نواز اور ادب ساز حلقوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے فن کاروں کے جدید تر تجربوں اور اشاعتی محاسن کی

جدید تر قدروں کا وہ یادگار اور مثالی پیکر بنادوں گا جس کے نقوش، ایک مدت تک سرمایہ دارانہ دباؤ نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بھینچ رکھے تھے۔۔ اب میں زیادہ جرات زیادہ خوبصورتی اور زیادہ حوصلے کے ساتھ اپنی دبی گھٹی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرسکوں گا۔۔ اب میں آپ کے اور زیادہ قریب آ گیا ہوں۔'' (۱۰)

یہ چودھری نذیر احمد کا وضاحتی بیان بھی ہے اور دو ماہی ''سویرا'' کی ادبی پالیسی بھی۔ ''سویرا'' کے ابتدائی چند شماروں پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بیان صداقت سے خالی نہیں ہے لیکن ضرورت ہے کہ مدیران (احمد ندیم قاسمی، نذیر چودہری فکر تونسوی کی ''بات چیت'' پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اداریے میں ادب کی ترقی پسند قدروں کے ذکر سے اجتناب کیا گیا ہے۔ لفاظی کی مدد سے مختلف مجرد بیان دیئے گئے ہیں۔ مثلاً 'یہ کسی معین منزل کی طرف اشارہ نہیں کرتا، یہ اردو کے نئے ادب کی ایک میزان ہوگا، یہ ادیبوں کے کسی خاص گروہ کا نمائندہ نہیں، وغیرہ (۱۱)۔ عجیب بات ہے کہ چودھری نذیر تو ایک نظریاتی پوزیشن لے رہے ہیں جبکہ ''بات چیت'' میں کسی بھی پوزیشن سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اس بات چیت کے اختتام پر لفظوں کا ایسا گورکھ دھندا پھیلا دیا گیا ہے جس سے کسی واضح موقف یا پوزیشن کا اظہار نہیں ہوتا۔ درج ذیل سطور ہماری بات کو واضح کردیں گی۔

''سویرا ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح پر لکھنے والوں پر اپنے نظریات کو نہیں ٹھونسے گا بلکہ چند مشورے پیش کردینے کے بعد ان کے اثرات کا مطالعہ کرے گا۔ اس کی پالیسی نئے ادب کے رجحانات سے ہم آہنگ ہوگی اس کے مندرجات ادیبوں کی جگہ ادبیات سے عبارت ہوں گے اور یہ سڑے بسے مضامین کے متعلق ریاکارانہ انداز میں گرجتی اور گونجتی ہوئی تعریف کرکے ریت کے محل نہیں کھڑے کرے گا، ''سویرا'' کے ادارہ کے ان گنت فرائض میں اولین مقام اس عزم کو حاصل ہے کہ ''سویرا'' میں چھپنے والی ہر چیز ایک ایسے امتیاز کی مالک ہو، جو خواص کو جھنجھوڑ دے اور عوام کو چونکا دے۔ (۱۱)

اب مجلّہ کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو صورت حال واضح ہوسکتی ہے چنانچہ پہلے ہی شمارے میں فراق گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، مجید امجد، فکر تونسوی، ظہیر کاشمیری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، مخمور جالندھری، علی سردار جعفری، قتیل شفائی، عبدالمتین عارف، ظہیر کاشمیری، جاں نثار اختر اور دیگر کئی ترقی پسندوں کی منظومات، باری، ظہیر کاشمیری، منٹو، طفیل احمد اور پال رچرڈ کے مقالات، اختر حسین رائے پوری، بیدی، ممتاز مفتی اور اشک کے افسانے ڈرامے اور باری، طفیل احمد اور فکر تونسوی کے تحریر کردہ جائزے شائع کیے گئے۔ دوسرے شمارے میں بھی ظہیر کاشمیری، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی، مخمور جالندھری، فراق گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، منٹو، اشک عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، طفیل احمد خان اور عبدالمجید سالک جیسے اہل قلم شامل تھے۔

''سویرا'' کے یہ دونوں شمارے، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے شائع ہوئے تھے،جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس پذیرائی کے پیچھے یقیناً ترقی پسندتحریروں کا جادو کام کررہا تھا لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ چودھری نذیراحمد نے پہلے شمارے میں جس عزم کا اظہار کیا تھا اس پر وہ پوری طرح کاربند رہے تھے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ چودھری نذیر کے'ادب لطیف' کو چھوڑ کر آنے کے باوجود پرچہ اپنی ترقی پسندانہ ڈگر پر مسلسل آگے بڑھتا رہا اور ۱۹۴۹ء میں اپنی عارضی بندش تک اپنی روش پر قائم رہا بلکہ قیام پاکستان کے بعد اس میں خاصی انتہا پسندی آ گئی۔ اس تمام صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اس ادارتی تبدیلی نے ''ادب لطیف'' کے داخلی مزاج پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا، حتیٰ کہ سابق مدیر قتیل شفائی کی غزل کے علاوہ قتیل شفائی پر فکر تونسوی کا خاکہ ''بھولا بھالا'' فروری ۱۹۴۷ء کے پرچے میں شائع ہوا، لکھنے والوں میں بھی کوئی امتیازی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی دور سے پاکستانی دور کی طرف ''ادب لطیف'' کی پیش قدمی ہموار اور متوازن تھی لیکن آزادی کے بعد ترقی پسند ادبا میں انتہا پسندی آ گئی تو اس کی لپیٹ میں ''ادب لطیف'' میں آ گیا ایک تند و تیز تبصرے کی اشاعت پر عارف عبدالمتین صاحب کو چودھری برکت علی نے محتاط ہونے کی گزارش کی تو انہوں نے بقول خود تلخ ہو کر کہا ''میں احتیاط نہیں کرسکتا میں آپ کے ہاں سے جا رہا ہوں' عارف صاحب نے لکھا کہ ''جب میں چلا گیا تو ''ترقی پسند مصنفین نے ''ادب لـــــطیف'' کا بائیکاٹ کر دیا۔'' (۶۵) اور رسالہ ''استقلال'' پر عارف صاحب کے متذکرہ تبصرے کی وجہ سے ''ادب لطیف'' کی اشاعت پر پابندی لگ گئی۔'' (۱۲)

اگست ۱۹۴۷ء میں بھارت اور پاکستان کے نام سے دو جداگانہ مملکتیں وجود میں آئیں۔ تقسیم کے وقت لاہور سے ''سـویـرا'' اور ''ادب لـطیف'' اور ممبئی سے ''نیـا ادب'' نکل رہے تھے جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ تقسیم کے چند ماہ بعد، لاہور سے ہی ماہانہ 'نقوش' پشاور سے 'سنگ میل' اور جالندھر سے دو ماہی 'شاہراہ' کا اجراء ہوا۔ 'نقوش' ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کی ادارات میں نکلا۔ 'سنگ میل' کے مدیران میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، قتیل شفائی اور خاطر غزنوی کے نام شامل تھے۔ شاہراہ کے پہلے مدیر ساحرلدھیانوی تھے جو ۱۹۴۸ء میں لاہور چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے بقول:

> ''ساحرلدھیانوی کے لاہور سے آنے کے بعد یوسف جامعی نے ماہنامہ ''شاہراہ کی شروعات کی تو ساحر لدھیانوی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رسالے کا زیادہ تر کام پرکاش پنڈت ہی کرتے تھے مگر جب پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ بحیثیت مدیران کے جگری دوست رام پرکاش اشک کا نام دیا گیا تھا۔ پرکاش پنڈت کو اس کا بڑا دکھ

ہوا اور اس کی شکایت انہوں نے کئی دوستوں سے بھی کی بہرحال جب ساحر بمبئی (ممبئی) چلے گئے تو انہیں اس رسالے کی ادارت سونپ دی گئی۔'' (۱۳)

اب ہندوستان اور پاکستان سے ترقی پسند ادب کے چھ ترجمان رسالے باقاعدہ سے شائع ہو رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ''سویرا'' کا جو پہلا شمارہ نکلا، اس کے سرورق پر ''جدید فنکاروں کے خیالات کا سلسلہ'' کی بجائے ''ترقی پسند فنکاروں کی تخلیقات کا ترجمان'' تحریر کیا گیا۔ شمارہ نمبر ۴،۴ میں اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے ادب کی ترقی پسند تحریک کا ترجمان کے الفاظ درج کیے گئے اور شمارہ ۱۴۔۱۳ تک اسی طرح لکھے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ احمد راہی کی ادارت ختم کر کے اس کی ادارت حنیف رامے کے سپرد کر دی گئی اور یہ سرکاری طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا ترجمان نہ رہا۔ تب بھی اس پر یہی الفاظ درج تھے۔ یہ شمارہ ۱۶۔۱۵ میں ''ادب لطیف'' سے الگ ہوتے ہوئے چودھری نذیر احمد نے ''سویرا'' کا اجراء کیا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد پرچے کی ضبطی اور دیگر مشکلات کے باعث وہ زیادہ عرصہ تک ترقی پسندوں کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے چنانچہ شمارہ ۱۵ سے انہوں نے ترقی پسندوں کو الگ کرنے کے بعد تقریباً وہی کردار ادا کیا، جس کی شکایت انہیں ۱۹۴۶ء میں چوہدری برکت علی سے پیدا ہوئی تھی، ہوسکتا ہے اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہوں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۹ء (شمارہ ۸۔۷) میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی پہلی کل پاکستان کانفرنس میں ''ادب برائے انقلاب'' کا نعرہ لگایا تو حکومت نے اسے ایک ''سیاسی جماعت'' قرار دے کر اس کے دفتر اور ممبروں کے مکانوں پر چھاپے مارے اور کئی ادیبوں کو گرفتار کر لیا۔ شاید چوہدری نذیر احمد کو ترقی پسند ادبی تحریک کی ترجمانی کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا ہو۔ یہی نہیں، اسی شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا مقالہ ادارہ ''ادب لطیف جواب دے'' شائع ہوا۔

اس موقع پر ''ادب لطیف'' نے کانفرنس کے مندوبین پر شدید حملے کیے۔ کہا گیا کہ ترقی پسندی کی تحریک بنیادی طور پر ادبی تحریک ہے۔ اس لیے ادب کی شاہراہ سے الگ ہو کر سیاست کے خارزاروں میں قدم رکھنا اس کا مسئلہ نہیں۔ (۱۶) ادب لطیف نے رجعت پسند رسالوں، اخباروں اور ادیبوں کے بائیکاٹ پر بھی تنقید کی۔ ''سویرا'' میں احمد ندیم قاسمی نے ان دونوں باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ''ادب لطیف'' کے اعتراضات کی بنیاد یہ ہے کہ ''وہ ادب اور سیاست کے رشتے کو قبول نہیں کرتا۔'' (۱۵) اس شمارے کی ادارت ظہیر کاشمیری، احمد راہی اور عارف عبدالمتین کے ذمہ تھی۔ اس سے قبل تیسرے شمارے کی ادارت احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانی اور نذیر چوہدری جبکہ چوتھے شمارے کی ادارت کے فرائض ساحر لدھیانوی اور نذیر چوہدری ادا کر رہے تھے۔

جون ۱۹۴۸ء میں ساحر لدھیانوی کو ہراساں کر کے ملک سے نکالنے کی تحریک شدت اختیار کر گئی۔ ''شورش کاشمیری حکومت کے ایماء پر ساحر کا دوست بن کر انہیں پیار سے ترغیب دیتے تھے کہ اس ملک سے بچ

کر نکل جائیں ورنہ انہیں عبرت کا نشان بنادیا جائے گا۔'' (۱۶) اسی ذہنی کیفیت کے باعث ساحر جون کی ایک گرم دوپہر کو والٹن لاہور کے ہوائی اڈے سے دہلی چلے گئے۔ ساحر کے چلے جانے کے بعد نذیر چودھری کے ساتھ ظہیر کاشمیری اور احمد راہی مدیران کی صف میں شامل ہوگئے۔ شمارہ ۶۔۵ میں ظہیر کاشمیری میں بات چیت (اداریہ) میں لکھا:

> ''رفیقو! قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہاں کے سرکاری، نیم سرکاری اور رجعت پسند ادیبوں نے ہمارے آدرشی اتحاد اور تنظیمی سرگرمیوں پر طرح طرح کے ناروا حملے کیے، ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ ہماری سالمیت کو پارہ پارہ کرسکیں گے ہم سے ہمارے قلم چھین سکیں گے اور ہماری جمہور نواز ادبی کاوشوں پر زنجیر ڈال سکیں گے۔۔لیکن آج ہمیں پوری طرح آزما چکنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انہوں نے ہماری طاقت اور ہمارے عزائم کا غلط اندازہ لگایا تھا ہم نے خوداعتمادی، بلند حوصلگی اور یک رنگیٔ فکر سے ان کے تمام حملے پسپا کردیئے ہیں اور آئندہ زیادہ مضبوطی سے مدافعت کرنے کا تہیہ کیئے ہوئے ہیں۔'' (۱۷)

شمارے میں ممتاز حسین، عزیز احمد، ظہیر کاشمیری، سجاد ظہیر، طفیل احمد خان، عبداللہ ملک، اختر حسین رائے پوری اور باری کے مقالات، منٹو، عزیز احمد، ابراہیم جلیس، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، شفیق الرحمٰن، اے حمید، اوپندر ناتھ اشک اور حمید اختر کے افسانے، منٹو، کرشن چندر، ابن انشا، اختر انصاری، کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے طنزیہ مضامین اور ن۔م۔ راشد، ابن انشا، قیوم نظر، سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، فکر تونسوی، یوسف ظفر، مختار صدیقی، اختر الایمان، قتیل شفائی، صفدر میر، ضیا جالندھری، حامد عزیز مدنی، احمد راہی، فراق گورکھپوری، مجروح سلطان پوری، قیوم نظر، شکیل بدایونی، ناصر کاظمی، احمد ریاض اور متعدد دوسرے شعرا کی نظمیں، غزلیں اور گیت شامل تھے۔ برصغیر پاک و ہند کا شاید ہی کوئی اہم ادیب، شاعر اور افسانہ نگار ہو جو ان دنوں ''سـویـرا'' میں نہ چھپ رہا ہو۔ شمارہ نمبر ۹ کی ادارت میں بھی ظہیر کاشمیری اور احمد راہی ایک ساتھ تھے۔ اپنے اداریے میں ظہیر کاشمیری نے قارئین کو تین ہزار روپے کی ضمانت طلبی کی اطلاع دی اور لکھا:

> ''دو برس پہلے حکمران طبقہ نے ترقی پسند مصنفین کے بیباک ترجمان سویرا کو چھ ماہ کے لیے جبراً بند کردیا تھا۔ اب پھر حکومت پنجاب نے ایمرجنسی پاور ایکٹ کے ماتحت اس کے ناشر اور پریس سے تین، تین ہزار کی ضمانت طلب کرلی ہے۔ ارباب اقتدار نے شمارہ ۷، ۸ میں اداریہ، سجاد ظہیر کا پیغام، انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کا اقتباس قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ سویرا کے منتظمین نے حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کررکھی ہے۔ اس اپیل کی پیروی مشہور ترقی پسند بیرسٹر مسٹر محمود علی قصوری کررہے ہیں۔'' (۱۸)

اس شمارے کی اشاعت کے بعد مجلّہ ایک سال تک معطل رہا۔ احمد راہی اور نذیر چودھری کے زیر

ادارت آخری شمارہ، 'سویرا نمبر ۱۴۔۱۳ تھا۔ اس شمارے میں 'بات چیت' کے عنوان سے احمد راہی کا اداریہ خود تنقیدی کا زبردست نمونہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ الوداعی اداریہ ہو۔ یہ سچ مچ ترقی پسندوں کی طرف سے آخری اداریہ ثابت ہوا۔ یہ خود تنقیدی اس وقت کی تحریروں کی روشنی کسی حد تک جائز لگتی ہے:

> ''یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نمائندہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت روز بروز اپنا وقار کھو رہی ہے، ان کی نگارشات میں فنی اور خیالی گراوٹ آ رہی ہے۔ ترقی پسند شاعری میں تو خاص طور پر ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے۔ شاعر حضرات دھڑا دھڑا پرانے خیالات کی جگالی کر رہے ہیں۔ چھ سات سال پرانے فسادات کے زخموں کی بو ابھی تک ان کے دماغوں میں رچی ہوئی ہے۔ ابھی تک ان کے اشعار کھوکھلی آزادی کے تذکروں کے حامل ہیں اور ان کے کلام سے تازگی قدرت اور زندگی کی سرمستی مفقود ہوگئی ہے۔ ان کی تشبیہیں، استعارے، رمز و کنایہ گھس پٹ کر اپنی رنگینی کھو چکے ہیں اور حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اب کوئی پوری نظم یا پوری غزل پڑھنے کی تاب نہیں رہی۔ کسی نظم یا غزل پر لکھنے والے کو اپنی چھاپ نہیں جو اسے دوسرے شاعروں سے بلند نہیں تو کم از کم الگ ہی کر دے۔ سب لوگوں کا انداز بیان، الفاظ، تکنیک یکساں ہے۔ گویا فن کی تخلیق نہیں ہو رہی، میز اور کرسیاں بنائی جا رہی ہیں یہی حال افسانہ کا ہے۔ جب تخلیقات زنگ خوردہ اور بے جان ہو جائیں تو تنقید کے دست و بازو شل ہو جانا یقینی امر ہے۔ ابھی تک ترقی پسند ادیب اپنے آپ کو نت نئے اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ نہیں کر پائے اور اگلے ہوئے نوالے نگلنے میں مگن ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں تفکر اور گہرائی کے بجائے بوکھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ آ گئی ہے۔۔۔ اور یہی ادبی سطحیت اور پستی کا باعث ہے۔''(۱۹)

مذکورہ بالا سطور میں مدیران کی تلخی نمایاں ہے۔ اس ساری بحث کا اختتام ان لفظوں پر ہوتا ہے کہ 'ہم غیروں کے عیوب ظاہر کرتے ہیں، اپنوں کے دامنوں کے دھبے شمار کرنے نکلے ہیں۔۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ کام مشکل ہے مگر کیا کیا جائے کہ ادب، ہمیں دوستوں سے زیادہ عزیز ہے۔''(۲۰)

یہ اداریہ اسی طرح جذباتیت اور انتہا پسندی کا مظہر دکھائی دیتا ہے، جس طرح کے اداریے سویرا میں ترقی پسندی کے حق میں لکھے گئے تھے۔ اس اداریہ پر کسی طرح خود چودھری نذیر اثر انداز ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگلے ہی ماہ سے ادارتی عملہ تبدیل ہوگیا اور چودہری نذیر احمد نے ایک ابھرتے ہوئے فنکار اور خاندان کے ایک فرد حنیف رامے کو اپنا شریک مدیر مقرر کر دیا۔ اگرچہ ترقی پسند مدیر احمد راہی کے نکلنے کے بعد بھی 'سـویـرا' کا مزاج فوری طور پر تبدیل نہ ہوا، پھر بھی اداریے سے نئی سوچ واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ بات چیت کا آغاز اس جملے سے ہوا۔ ''خدا نے کہا، ''روشنی ہو جائے''، روشنی ہوگئی اور

خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے۔'' (۲۱)

یہ آسمانی فرمان گویا اس بات کا علامتی اعلان تھا کہ ''سویرا'' کے آسمان پر اب تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اب اس پر روشنی اتار دی گئی۔ فلسفیانہ انداز کا یہ طویل اداریہ تبدیلی اور توازن کی بات کرتا ہے، ملک اور اس کی مٹی کو تسلیم کرنے کی بات کرتا ہے اپنے آپ کو تسلیم کرنے کی بات کرتا ہے لیکن وطن کی اس مٹی کو آثار قدیمہ کی دولت کو رد کر دیتا ہے۔ وہ پاکستان کے عظیم تہذیبی آثار کے وجود کو جھٹلاتا اور انہیں بنجر قرار دیتا ہے۔ چند برس بعد بھٹو اور ضیاء کے تعلیمی نظام سے اس تہذیبی ورثے کو نکال کر محمد بن قاسم کو پہلا پاکستانی قرار دیا تھا۔ ۷۱۲ سے پہلے کی ہماری تاریخ بنجر تھی۔ ہندوستان سے ہمارا رشتہ معدوم تھا۔ اداریہ کی چند سطور قابل مطالعہ ہیں:

''اپنے یہاں ہی کی مثال لیجئے۔ موئن جو داڑو اور ٹیکسلا کی کھدائی ہوئی ہے۔ یہ تہذیبیں، فنون لطیفہ کے لحاظ سے بالکل بنجر ہیں۔ مصوری، مجسمہ سازی، ادب، شاعری وغیرہ کی ان تہذیبوں میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے یہ تہذیبیں گونگی ہیں، بہری ہیں اندھی ہیں۔۔۔ یہ تہذیبیں محض فائدہ پرست تہذیبیں تھیں اس لیے تو انہیں کھود کے باہر نکالنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ ٹیکسلا میں عجائب گھر۔۔ اور مختلف مقامات پر جو معابد ہیں ان میں بدھ جی کے بت یوں لگتے ہیں جیسے ٹھیکیداروں سے بنوائے ہیں۔ ایک ہی سانچہ ہے ایک ہی احساس ہے کھلونے بنانے والی کسی فیکٹری کے نمونے سکے دیکھئے برتن دیکھئے گلیاں اور بازار دیکھئے۔ ادھر موہنجوداڑو میں سے جو دو چار مجسمے اور کھلونے نکلے ہیں تو ان سے کیا ہوتا ہے۔ ایک فن کار کے لیے اس ماضی کی زندگی تو یہی ہے کہ بھئی غربت کی اچھی مثال ہے۔ ذرا سوچیے ہزار دو ہزار سال بعد آپ کے شہر کی کھدائی ہوتی ہے اور کوئی بھولا بھٹکا فن کار ادھر آنکلتا ہے اور آپ کے یہاں کی گندی نالیوں کے انتظام اور روشن دانوں کی فراخی کا ذکر کر رہا ہے اور جیسا آیا تھا ویسا جا رہا ہے اس کا کچھ بھی نہیں بدلا بگڑا۔'' (۲۲)

اس شمارے کے ساتھ ہی ''سویرا'' کا انجمن ترقی پسند مصنفین کی باضابطہ ترجمانی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ''جان پہچان'' جس میں ادیبوں اور شاعروں کا دلچسپ انداز میں تعارف ہوتا تھا۔ یہ کہہ کر تبدیل کر دیا گیا کہ ان صفحات میں قصیدہ خوانی یا گالی ناموں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ کچھ نئے سلسلے بھی شروع کر دیئے گئے۔ اب ادب لطیف کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ ۴۸۔۱۹۴۷ء کے دوران عارف عبدالمتین اس کی ادارت کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کے نئے منشور کا اجرا کیا گیا جو ادب اور ادیبوں کو انتہا پسندی کی طرف لے گیا۔ اسی سال میرزا ادیب، ادب لطیف میں بطور مدیر واپس آ چکے تھے۔ وہ ماضی میں بھی مجلّہ کو ترقی پسند بنیادوں پر چلاتے رہے تھے لیکن وہ انتہا پسندی کے خلاف تھے لیکن جلد ہی ترقی پسند تحریک سے ان کے اختلافات پیدا ہوگئے۔ ڈاکٹر شگفتہ حسین کے مطابق:

''میرزا ادیب نے مارچ ۱۹۵۰ء کے اداریے میں ترقی پسند تحریک پر کڑی تنقید کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ انجمن قطعاً ایک ادبی ادارہ نہیں بلکہ ایک سیاسی جماعت بن چکی ہے بلکہ یہ

کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک بیرونی سیاسی جماعت کی شاخ بن کر رہ گئی ہے، اور ترقی پسندوں نے میرزا ادیب کو اپنی صف سے نکال باہر کیا اور باقاعدہ یہ خبر چھاپ دی گئی کہ 'میرزا ادیب' کو نظریاتی اختلاف کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کی تنظیم سے نکال دیا گیا ہے۔'' (۲۳)

دراصل میرزا ادیب معتدل مزاج مدیر تھے۔ وہ ترقی پسندوں کی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ رجعت پسند ادیبوں کی انتہا پسندی کے بھی مخالف تھے۔ انہوں نے پاکستانی ادب اور 'اسلامی ادب' کی اسی طرح مخالفت کی جس طرح اعتدال سے بڑھے ہوئے ترقی پسند ادب کی۔

''میرزا ادیب کا یہ اعتدال اس وقت ان کی اخلاقی فتح میں بدل گیا جب اگست ۱۹۵۲ء میں ترقی پسندوں نے انتہا پسندی کی روش ترک کردی اور اپنا ۱۹۴۹ء کا منشور بھی منسوخ کر دیا اور ایک مرتبہ پھر ادب لطیف ترقی پسند مصنفین کا آرگن بن گیا۔'' (۲۴)

لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کے دوبارہ 'ادب لطیف' میں آنے کے فوراً بعد کی روش کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک 'ادب لطیف' کو ترقی پسندی کی آواز بنائے ہوئے تھے۔ مارچ ۱۹۴۹ء کے شمارے کا اداریہ ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ترقی پسندی کے حوالے سے 'ادب لطیف' کی طویل جدوجہد کا ذکر پوری تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا کہ ''حالات ابتر ہیں اور ماحول قطعاً سازگار نہیں ہے لیکن ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں ہوسکتا۔'' (۲۵) ''ادب لطیف۔ ماضی کی جھلک اور موجودہ لائحہ عمل کی وضاحت'' کے زیرِ عنوان مدیران (چودھری برکت علی، میرزا ادیب، قتیل شفائی) لکھتے ہیں:

''یہ ادبی جریدہ، جو زندگی کے بارہ سال گزار چکا ہے، ابھی ابھی چھ ماہ کی مکمل بندش کے بعد ازسرِنو نئے ولولوں اور نئی امنگوں کے ساتھ میدانِ عمل میں اترا ہے۔ ہمیں یہ بات کہتے ہوئے قطعاً جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ادب لطیف شروع ہی میں جس راستے پر گامزن ہوا تھا، اب تک بدستور اسی راستے پر قدم اٹھا رہا ہے۔۔۔ غیرملکی سامراج نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کے ترقی پسندانہ رجحانات کا گلا گھونٹ دے۔۔۔ اس کے بعد 'ادب لطیف' پر دفاعی اقدامات کے زیرِ اثر مقدمہ چلایا گیا اور 'ادب لطیف' کے مالک و مدیر کے خلاف بلاضمانت وارنٹ نکالا گیا۔ 'ادب لطیف' نے اس اوچھے وار کا بھی جرات اور دلیری کے ساتھ سامنا کیا۔۔ حکومت کے ہاتھ میں دفاع کا مہلک ہتھیار تھا۔ ادب لطیف کو نہ صرف یہ کہ انتہائی دیدہ دلیری سے بدنام کیا گیا اور اس پر عریانی کی تبلیغ کا شرمناک الزام لگایا گیا بلکہ اسے ختم کر دینے کی بھی کوشش کی گئی۔۔۔ ادب لطیف تو تعاون پر پر آمادہ رہا، آمادہ ہے مگر حکومت نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر 'ادب لطیف' اور 'ادب لطیف' کے علاوہ ماہنامہ 'نقوش' اور دوماہی ''سویرا'' پر بھی چھ ماہ کی بندش عائد کی۔۔۔ ادب لطیف کی وہی

روش ہے جو پہلے تھی۔ یعنی ترقی پسندانہ میلانات کی نشرواشاعت اور صالح ادب کی تبلیغ اور اس معاملے میں ہر جائز اور خود دارانہ طریقے سے حکومت کے ساتھ تعاون۔''(۲۶)

اسی اداریہ کے آخر میں ترقی پسند شاعر اور نقاد علی سردار جعفری کی گرفتاری پر احتجاجی نوٹ بھی شائع کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء کے سالنامہ میں ترقی پسندانہ نظریات سے وفاداری کا اعلان کیا گیا۔ سالنامہ ۱۹۵۰ء میں بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ اداریے میں ادیب کی غیر جانبداری کو اوپر کے طبقے کی فریب کاری کہا گیا اور اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ ''ہم ترقی پسندانہ رجحانات کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔۔۔کیونکہ بات ہماری جانبداری کا تقاضہ پورا کرتی ہے مگر فنکارانہ انداز میں۔''(۲۷)

اس کے دس برس بعد تک میرزا ادیب کی ادارت کے دوران 'ادب لطیف' ترقی پسند افکار کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا رہا لیکن ۱۹۵۲ء کے بعد سے اس کی حیثیت ترقی پسندی کے ترجمان کی نہ رہی، گو آج بھی یہ اُردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ پاک و ہند کی تقسیم سے قبل نکلنے والے ترقی پسندوں میں مجلوں ''نیا ادب'' نے بھی تقسیم کے بعد اپنا سفر جاری رکھا اگرچہ یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا اور پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی ترقی پسند اور ادبی مجلوں پر سختیاں جاری رہیں۔ آزادی سے قبل اس کے سرورق پر درج ہوتا تھا ''ترقی پسند مصنفین کی دو ماہی کتاب'' لیکن آزادی کے بعد اس کی عبارت بدل گئی اور لکھا جانے لگا:

''ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ماہنامہ'' اکتوبر ۱۹۴۸ء کے شمارے میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سردار جعفری اور چیخوف کے افسانے، ممتاز حسین کا مقالہ ''ادبی قدریں'' اور وارث حسین علوی کا مقالہ ''فسادات پر سب سے اچھے افسانے'' شامل ہیں۔ نظم و غزل میں جگر مراد آبادی، فارغ بخاری، باقر رضوی، حبیب تنویر، فکر تونسوی اور غلام ربانی تاباں کے نام قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے مشترکہ اداریہ (حرف آغاز) کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے:

''اس مہینے میں دو بُری خبریں آئی ہیں ایک خواجہ احمد عباس کی کہانی ''سردار جی'' کے متعلق، جسے یوپی کی حکومت نے ضبط کر کے مصنف پر مقدمہ چلا دیا ہے۔ دوسرے پاکستان کے تین ادبی رسالوں کے متعلق جنہیں حکومت پاکستان نے چھ ماہ کے لیے بند کر دیا ہے۔'' اس پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے اداریہ نویسوں نے کہا کہ یہ کہانی دراصل فرقہ واریت کے زہر کو دور کرنے کے لیے لکھی گئی لیکن مصنف پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا گیا۔ پنجابی اور اُردو کے ترقی پسند ماہنامہ ''پریت لڑی'' کے ایڈیٹر اور پنجابی کے معروف ادیب سردار گوربخش کا بیان، جو اداریے کے نیچے شائع کیا گیا ہے، میں کہا گیا کہ کہانی میں مذہبی تعصب کی حماقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مصنف نے تعصّبات کا پرچہ چاک کیا ہے۔ سردار جی کا کردار اتنا اعلیٰ ہے کہ اس پر دنیا کا ہر فرقہ فخر کر سکتا ہے۔ اس افسانے کے دفاع میں اُردو اور ہندی کے ۳۲ ممتاز ادیبوں کا بیان بھی شائع کیا گیا ہے

جس میں یو پی حکومت کے اقدام کو اچھے ادب اور آرٹ پر حملہ قرار دیا گیا ہے۔ اداریے میں پاکستان کے تین ترقی پسند مجلوں پر پابندی عائد کرنے کی ان لفظوں میں مذمت کی گئی:

''اسے سے بھی زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے لاہور کے تین ترقی پسند ادبی رسالوں کو چھ ماہ کے لیے بند کیا ہے جس سے پاکستان اور ہندوستان کی ادبی زندگی کو بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ 'نقوش' جو احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں پچھلے چار پانچ سے نکل رہا تھا اس لیے قابل عتاب سمجھا گیا کہ اس میں سعادت حسن منٹو کی ایک کہانی ''کھول دو'' شائع ہوئی تھی جو اپنی سچائی، خلوص اور اثر کے اعتبار سے اُردو کی بہترین کہانیوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور پاکستان کو اس پر فخر کرنا چاہیے کہ ایسی اچھی کہانی ایک پاکستانی ادیب نے لکھی۔ اس کہانی کا موضوع اغوا شدہ عورتوں کی بپتا ہے جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان کا ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ دونوں جگہ کی حکومتیں اغوا شدہ عورتوں کو واپس لاکر پھر سے بسانے کی کوشش کر رہی ہیں ایسی صورت میں ان حکومتوں کو ان تمام عناصر کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیے جو اپنی ہوس کاری کی وجہ سے اغوا شدہ عورتوں کے مصائب میں اضافہ کر رہے ہیں اور ہمارے سماجی زندگی کی گندگیوں کو بڑھا رہے ہیں۔ منٹو نے بھی انہیں عناصر کو بے نقاب کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ منٹو نے کوئی جرم کرنے کے بجائے ایک بہت بڑی قومی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن ادب لطیف اور سویرا پر کیا الزام ہے؟ حکومت نے ان کا تو جرم بھی بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ بس پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت ان کی آواز بند کر دی ہے۔ 'پاکستان ٹائمز اور 'امروز' (لاہور) کی طرح ہم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ادب نوازی۔۔۔ پالیسی کسی مہذب حکومت کے شایان شان نہیں ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایک ایسی حکومت جو اپنے آپ کو آزاد کہتی ہو۔ اس سوال پر بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک تجویز منظور کی ہے اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ادب لطیف، سویرا اور نقوش پر سے پابندی اٹھا کر اپنی ادب دوستی کا ثبوت دے۔'' (۲۹)

''نیا ادب'' کا اگلا شمارہ خاص شمارہ تھا۔ بڑے سائز کے کم و بیش اڑھائی سو صفحات پر مشتمل خاص نمبر میں جنگ آزادی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اکتوبر کے شمارے میں اعلان کیا گیا کہ دسمبر۔جنوری کا یہ مشترکہ وہ شمارہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۵راگست ۱۹۴۸ء کے جشن آزادی تک اُردو ادب کے ذریعے تحریک آزادی کی مکمل تاریخ ہوگا۔ اداریہ پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ نظم و نثر کا یہ انتخاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھا جسے اڑھائی سو صفحات تک لانا پڑا اور اس میں بہت سی قیمتی تخلیقات چھپنے سے رہ گئیں مثلاً سجاد ظہیر، سبط حسن، جذبی، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، وشوا متر عادل، ہنسراج رہبر، اوپندر ناتھ

اشک، مہندر ناتھ، اختر الایمان، سردار جعفری، ممتاز حسین، کیفی اعظمی، پریم دھون، خواجہ احمد عباس، منٹو، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین اور پریم چند سمیت نظم ونثر کی متعدد تخلیقات، انتخاب میں شامل ہونے کے بعد نکال دی گئیں۔ اداریہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ اس شمارے کے لیے ہماری تحریک آزادی کے حوالے سے ایک سیاسی مضمون کی بھی کمی ہے جسے ڈاکٹر اشرف نے لکھنا تھا لیکن اس دوران پہلے وہ بیمار ہوگئے۔ پھر پاکستان کی حکومت نے انہیں گرفتار کرلیا اور اب وہ انگلستان میں ہیں۔'' (۳۰) اداریہ کے آخر میں کیفی اعظمی کا شکریہ بھی ادا کیا گیا جنھوں نے اس مجموعے کے انتخاب میں سب سے زیادہ کام کیا۔

یہ خاص اشاعت (۱۹۴۷۔۱۸۵۷) ۹۰ سال کے اُردو ادب کا انتخاب ہے جس میں غالب، حالی، اقبال، شبلی نعمانی، چکبست، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، جوش، ساغر نظامی، مجاز، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، پریم چند، منٹو، ساغر نظامی، جاں نثار اختر، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، سید مطلبی فرید آبادی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، فراق وامق، جونپوری، جگر مرادآبادی، دیوندر ستیارتھی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، نیاز حیدر، قتیل شفائی، ممتاز حسین عبدالمتین عارف، عبدالمجید سالک اور مجروح سلطان پوری کی نثری اور شعری تخلیقات پر مبنی ہے۔

جنوری ۱۹۴۹ء میں ابھی پرچہ زیرِ تکمیل تھا، جب اس کے ایک مدیر علی سردار جعفری کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر تحفظ امن عامہ کے قانون کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔ اس گرفتاری کے خلاف انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی نے ۲۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک احتجاجی اجلاس منعقد کیا۔ جاری کیے جانے والے بیان میں بتایا گیا کہ ان پر فرقہ پرستی اور مذہبی جذبات پر انگیختہ کرنے کے مضحکہ خیز الزامات عائد کیے گئے حالانکہ ان کی تحریریں فرقہ پرستی کے خلاف مسلسل جدوجہد کی علامت ہیں۔ بیان میں اس بات کا انکشاف بھی ہوا کہ کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے ہیں۔

آزادی سے قبل پنجابی زبان کے ممتاز ترقی پسند ادیب نے ضلع امرتسر میں ایک اشتراکی کمیون ''پریت نگر'' آباد کیا جو ہندوستان بھر کے آزادی کے متوالوں اور ترقی پسند ادیبوں کا روحانی مرکز بن گیا۔ گوربخش سنگھ نے وہاں سے پنجابی کا ایک ادبی اور سماجی ماہنامہ جاری کیا جو جلد ہی اُردو میں بھی شائع ہونے لگا۔ یہ دراصل سماجی اور تعلیمی تحریک تھی جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں شروع ہوکر تیسری نسل تک کامیابی سے جاری ہے۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن کی طرز پر لیکن سیاسی شعور کے ساتھ۔ گوربخش سنگھ چونکہ خود ادیب تھے اس لیے انہوں نے ''پریت لڑی'' کے نام سے ادبی ماہنامہ کا اجرا کیا۔ اس سیاسی شعور کا اظہار وہ اپنے اداریوں اور دیگر مضامین میں کرتے رہے۔ ستمبر ۱۹۴۲ء تحریک آزادی کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہا: ''آج میں جاپان اور جرمنی کے خلاف انگریزوں کو فتح یاب کرانا، ہندوستان کی یزادی کو یقینی بنانا سمجھتا ہوں۔'' (۳۱)

اس وقت ہندوستان بھر کے ترقی پسند ادیب فاشزم کے خلاف اپنی آواز بلند کررہے تھے اور عالمی

امن کے لیے کوشاں تھے۔''پریت لڑی '' کا بھی یہی موقف تھا۔''پریت لڑی '' شعروادب کے اصلاحی اور سیاسی موضوعات پر بھی مختلف مباحث کو شامل اشاعت کرتا تھا۔ پریت لڑی بنیادی طور پر چونکہ پنجابی ماہنامہ تھا اور اُردو ایڈیشن میں بھی زیادہ تر پنجابی سے تراجم کر کے شائع کیے جاتے تھے اس لیے اُردو شعروادب کا مواد نسبتاً کم ہوتا ہے پھر بھی جوش، ساحر لدھیانوی، کرشن، قمر جلال آبادی حفیظ ہوشیار پوری اور ایسے ہی کئی معتبر نام دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ساحر لدھیانوی کا بیشتر ابتدائی کلام'پریت لڑی ' کے اُردو ایڈیشن میں مل جاتا تھا۔

''اُردو ادب کی انقلابی قدروں کا نقیب سنگ میل ۱۹۴۸ء میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، قتیل شفائی اور خاطر غزنوی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور اپنے انقلابی ہونے کا دعویٰ سچ کر دکھایا۔ پہلے شمارے کے قلمکاروں میں جوش ملیح آبادی، میرزا ادیب، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، ن م راشد، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، باقی صدیقی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، اے حمید، حفیظ ہوشیار پوری، اے حمید، مختار صدیقی، قیوم نظر، حفیظ ہوشیار پوری، سیف الدین سیف، مختار صدیقی، عبدالحمید عدم، شمیم بھیروی مقصود زاہدی خاطر غزنوی اور فضل حق شید جیسے نام شامل تھے۔''ہماری منزل'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اداریہ میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی انسانی ہلاکتوں پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا گیا ہے:

> ''تقسیم کے بعد ہماری صدیوں کی تہذیب پر جو انقلاب ٹوٹا ہے۔ اس نے ملک کے طول و عرض میں اضطراب و انتشار کی ایسی لہر دوڑا دی کہ ہم اپنی سماجی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کر رہے ہیں ایسا خلا جسے پر کرنے کے لیے مذہبی دیوانگی کا اندھا جوش اور سنہری رو پہلی سیاسی مصلحتوں کا شعور دونوں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ہماری ایک صدی کی سیاسی جدوجہد کا یہ حسرتناک انجام انگریز سامراج کی شاطرانہ چال کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ۱۵ اگست ہماری دو سو سال کی چھینی ہوئی آزادی کے حصول کا پہلا دن مسرتوں کی طرب افزا گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے کرب و اندوہ کا سیلاب بھی اپنے جلو میں لایا۔ بٹوارے میں ہمیں سٹرلنگ پونجی، سامان حب اور دوسری چیزوں کے علاوہ نچی ہوئی عصمتیں، کچلی ہوئی لاشیں، تباہ حال انسان اور تعصب و منافرت کی بے اندازہ دولت بھی ملی اور اب ہم آزاد ہیں ، اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے ، ماؤں، بہنوں اور بچیوں کی عصمتیں لوٹنے اور اپنی شرمناک ذہنیت کا نقارہ پیٹنے کے لیے ہم آزاد ہیں۔ بالکل آزاد۔ اخلاق اور شرافت کی قدروں کا گلا گھونٹ کر ان کی لاش کو ہم نے گہرا دفن کر دیا ہے۔ اتنا گہرا جہاں سے صدیوں تک اس کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں اور انسانیت کا لبادہ اتار کر ہم بالکل ننگے ہو گئے ہیں کیونکہ ہم آزاد ہیں اور آزادی کسی قید کو گوارا نہیں کر سکتی۔ اب کسی اجنبی طاقت کی ہم پر حکومت نہیں رہی۔

اب کسی محاسبے کا ہمیں خوف نہیں رہا۔ اب ہم آزاد ہیں وحشیوں کی طرح آزاد۔۔حیوانوں کی طرح آزاد۔۔ درندوں کی طرح آزاد۔۔'' (۳۲)

فارغ بخاری کا تحریر کردہ یہ اداریہ شروع سے آخر مایوسی سے بھرا ہوا ہے۔ چار صفحات پر مبنی یہ تحریر رجائیت سے مکمل طور پر خالی ہے۔ مدیرِ محترم کے مطابق ان حالات سے ترقی پسند فنکاروں کا طبقہ بھی متاثر ہوا ہے اگر چہ وہ فسادات کے حوالے سے بھر پور انداز میں لکھ رہے ہیں لیکن ان کے سامنے مستقل کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ روٹی مہنگی ہے اور ادب سستا ہے۔ لکھنے والے معاشی مشکلات میں پھنسے ہیں۔ ان کے اندر کوئی ایسی بات نہیں رہی جو ترقی پسند پہلو سے درست ہو۔ مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ سامراجی عزائم سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اہلِ قلم کو لکھنے سے زیادہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مجلّہ کے مندرجات میں مایوسی کی بجائے رجائیت کا عنصر غالب ہے وہ اپنی اداریے کی اختتامی سطور میں، خود بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ: ''یہ اس پروگرام کی ایک مختصر سے جھلک ہے جسے لے کر سنگ میل میدان میں آیا ہے اور لمبے چوڑے بلند بانگ دعووٴں کی بجائے وہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔'' (۳۳)

الجھاؤ، کشمکش اور انحطاط کی یہ کیفیت چوتھے شمارے سے بھی ظاہر ہے لیکن وہ نئے ادب کے علمبرداروں کے ہاتھ میں مستقبل کی باگ دوڑ دیکھتے ہیں۔ اداریے میں فارغ بخاری پرچے کی اشاعتی پالیسی کو واضح کرتے ہوئے وہ صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں کہ: ''اس طرح ہم اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے جو نئے معمار پیدا کریں گے۔ وہ سب کے سب ''۔۔۔'' اور ''حرامجادی'' یا خدا اور رقص ابلیس لکھنے والوں کے بجائے ''ان داتا'' اور ''ہیروشیما جیسی عظیم تخلیقات پیش کرنے والے ہوں گے۔'' (۳۴)

اسی طرح نئے حادثے کے عنوان سے اپنے ذیلی اداریے میں تقسیم کے باعث اُردو زبان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے وہ اعلان کرتے ہیں کہ ''اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کا ناقابل تقسیم ترکہ ہے'' (۳۵) اس شمارے میں بھی جوش، قتیل شفائی، فکر تونسوی، احتشام حسین، ممتاز حسین، احمد فراز، شوکت صدیقی، اثر لکھنوی باقی صدیقی اور خاطر غزنوی سمیت کئی ممتاز اہلِ قلم کی نثری اور شعری تخلیقات اس کا حصہ بنیں۔

''سنگ میل'' کے پانچویں شمارے (۱۹۴۹ء) کا اداریہ ''ادب اور احتساب'' ادبی رسالوں کی بندش، ادیبوں کی زبان بندی اور ترقی پسند فنکاروں کی نگرانی کرنے اور انہیں ڈرانے دھمکانے کے حربوں پر احتجاج کے ساتھ ساتھ ترقی پسندوں پر فحش نگاری کے الزامات کی بھی مذمت کرتا ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء کے روزنامہ 'ڈان' میں ''ترقی پسندانہ فحاشی'' کے عنوان سے جو اداریہ شائع ہوا اس میں حکومت کو مشورہ دیا گیا کہ ایک ایسا محکمہ احتساب قائم کیا جائے جو ادیبوں کی تحریروں کو چھپنے سے پہلے انہیں سنسر کرے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''سنگ میل'' کے مدیر فارغ بخاری نے واضح کیا کہ ڈان کا یہ اداریہ ادیبوں کی ذہنی اور فکری آزادی سلب کرنے کے لیے ایک نیا فتنہ ہے اور یہ کہ کوئی احتساب بھی ادیبوں کے فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ نہیں

بن سکتا۔ ظہیر کاشمیری کا مقالہ ''سرخ چین کو سلام'' اس شمارے کی خاص چیز تھی۔

چھٹے شمارے میں 'سنگ میل' کی ایک سالہ کارکردگی کا جائزہ پیش کیا گیا۔ سال بھر کے چھ شماروں میں ۸۵۰ صفحات شائع ہوئے جن میں ۴۵ مقالے، ۳۵ افسانے، خاکے، چار ڈرامے، دو رپورتاژ، ۱۲۰ نظمیں غزلیں اور ۵ گیت شامل تھے۔ اسی طرح سنگ میل کے ہر شمارے میں ''اٹک کے اس پار'' کے عنوان سے پشتو شعر و ادب اور ثقافت کو بڑھاوا دیا گیا۔ اس تمام عرصہ میں ''سنگ میل'' کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے اور اس کا گلا دبانے کی کوششیں کی گئیں۔۔ ساتواں۔ آٹھواں شمارہ سرحد (خیبر پختونخوا) کے ادب و فن اور ثقافت پر مبنی خصوصی شمارہ تھا جو لگ بھگ چھ سو صفحات میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ اور اس کی پذیرائی کرنے والوں میں مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، احتشام حسین، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، ممتاز حسین، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس اور خدیجہ مستور سمیت دو درجن ادیبوں اور شاعروں کے نام تھے۔ پشتون دھرتی کے حوالے سے اقبال، قتیل شفائی، ظہور نظر، احمد فراز، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، محسن احسان اور احمد فراز سمیت متعدد غیر پشتون شعرا نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ سولہ مقالات میں پشتون معاشرے کی سیاسی سماجی ثقافتی اور ادبی تحریکوں کا احاطہ کیا گیا۔ اسی طرح ''ادبیات سرحد'' کے عنوان سے اجمل خٹک، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، نسرین بخاری، ضیا جعفری اور عبدالودود قمر نے پشتو، ہندکو، فارسی، چترالی اور اُردو ادب کے تراجم اور ان کا جائزہ پیش کیا۔ شمارے کا ایک حصہ افسانوں اور ایک حصہ مشاہیر سرحد کے لیے مختص کیا گیا۔

سنگ میل صحیح معنوں میں اُردو ادب کی انقلابی قدروں کا نقیب ثابت ہوا۔ نویں شمارے میں بھی جوش ملیح آبادی، ممتاز حسین، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں، احمد ریاض، فراق گورکھپوری، عدم، احمد فراز، جمیل ملک غلام ربانی تاباں، شوکت صدیقی، کرشن چندر، فکر تونسوی، کمال احمد صدیقی، رضا ہمدانی بلراج کومل اور فراق گورکھپوری جیسے اہم ادبی نام شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا جب سرکاری اور قومی اداروں کے دروازے ترقی پسند اداروں پر بند کیے جارہے تھے اور ان کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ''گریز داز صفِ ما'' کے زیر عنوان اپنے اداریے میں فارغ بخاری نے لکھا کہ ''ہم امن چاہتے ہیں، سچا جمہوری نظام چاہتے ہیں، ایسا نظام جس میں طبقاتی اونچ نیچ نہ ہو، جس میں انسانیت کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہو، جس میں محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور کلرکوں کے لیے سہولتیں ہوں جس نظام میں فن آزاد ہو، قلم آزاد ہو اور انسان آزاد ہو'' (۳۶)

۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش مقدمے کی آڑ میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر نیا حملہ ہوا اور نئی سختیاں مسلط کردی گئیں 'سنگ میل' بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور 'ادب لطیف' یا 'سویرا' کی طرح اپنا کردار تبدیل کرنے کی بجائے برسوں کے لیے خاموش ہوگیا۔ دو دہائیوں بعد یہ دوبارہ پشاور سے ہی

طلوع ہوا اپنی ترقی پسند سوچ کے ساتھ لیکن اس بار اس کی جون بدلی ہوئی تھی اور یہ پاکستان کے لوک ادب کے ایک مجلّہ کے طور پر سامنے آیا۔

۱۹۴۸ء میں دو نئے ترقی پسند جرائد کا اجرا ہوا۔ لاہور سے ماہنامہ 'نقوش' اور جالندھر سے دو ماہی شاہراہ 'نقوش' کے ناشر محمد طفیل تھے جو ادارہ فروغ ادب کے مالک بھی تھے۔ نقوش ادارت ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کر رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے دو ترقی پسند نہیں۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نقل مکانی کر کے پاکستان آ گئی تھیں۔ ہاجرہ، احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مل کر نقوش نکالنے لگیں۔ ترقی پسند ادارت کے باعث نقوش کا ادارتی لب و لہجہ اسی انتہا پسندی کا مظہر تھا، جس کا شکار اس سے قبل 'نیا ادب' اور 'سویرا' چلے آ رہے تھے لیکن تحریروں کے انتخاب میں توازن کا مظاہرہ کیا گیا تھا مثلاً پہلے ہی شمارے میں روایت پسند اور ترقی پسند ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں اگر ایک طرف غلام رسول مہر، حفیظ جالندھری، یوسف ظفر، اختر شیرانی، قیوم نظر اور اثر لکھنوی وغیرہ کے نام تھے تو دوسری طرف عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ہاجرہ مسرور، علی سردار جعفری، احتشام حسین اور خدیجہ مستور کے نام بھی نمایاں ہیں۔ ''طلوع'' کے نام سے اداریہ ہاجرہ مسرور کا لکھا ہوا ہے جس میں سنجیدگی اور تجربے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پورا اداریہ اُردو زبان کی بقاء اور نکھار کے مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ اداریہ نویس باقی ترقی پسندوں کی طرح اُردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں پرانے میل جول کا نتیجہ سمجھتی ہیں کہ یہ کسی ایک خاص صوبے یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کے سوال پر انہوں نے سیر حاصل بحث کی اور نتیجہ اخذ کیا کہ ''اُردو اب آزاد عوام کی زبان ہے۔'' (۳۷) ادبی رسائل کے بارے میں بات کرتے ہوئے مدیرہ نے کہا کہ وہ رسائل اب تک ایک ہی ڈھرے پر چلتے آئے ہیں۔ افسانہ، نظم اور غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہر اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت ہے جس کے اثرات ادب کو زندگی کا ترجمان بنا دیں۔ حالات نئے ہیں اس لیے نئے لکھنے والوں کی بھی ضرورت ہے۔ ''نقوش'' نئے لکھنے والوں کو سامنے لائے گا۔ اداریے کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے: ''ہم آزاد ہیں اور اپنے ملک کے وفادار ہیں، اس لیے لازمی طور پر ترقی پسند ہیں۔'' (۳۸)

ترقی پسندی کی یہ وہ تعریف ہے، جو ان کے حوالے سے پھیلائے گئے شکوک و شبہات کو رفع کر دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی زیرِ ادارت نقوش کے کل دس شمارے شائع ہوئے۔ اس دوران ایک بار ''نقوش'' کی اشاعت پر پابندی بھی لگی۔ دسویں شمارے کی اشاعت تک غالباً ''نقوش'' کی انتظامیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور دونوں مدیران کو مجلّہ کی ادرتی ذمہ داریوں سے برطرف کر دیا گیا۔ ان دس شماروں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ترقی پسند اور اہم اہلِ قلم ہو جسے نقوش کے اوراق پر جگہ نہ دی گئی ہو۔

''نقوش'' نے اس دوران تین خاص نمبر بھی شائع کیے۔ چوتھا شمارہ جشن آزادی نمبر ساتواں شمارہ عالمگیر امن نمبر اور آٹھواں شمارہ آزادی نمبر تھا۔ پہلے جشن آزادی کے موقع پر اس خصوصی اشاعت میں اداریے کے علاوہ احتشام حسین، فکر تونسوی کے مقالے ترقی پسند فکر کے ترجمان تھے۔ احتشام حسین نے ادیب کی حب الوطنی اور ریاست سے اس کی وفاداری کے سوال سے جبکہ فکر تونسوی نے ''ادیب اور عوامی ادب'' کے عنوان سے تنقیدی لب و لہجے میں کئی چبھتے ہوئے سوال اٹھائے ہیں۔ 'جائزے' کے زیر عنوان اُردو نظم، اُردو نثر، اُردو، سیاست اور سماج کے پہلے سال کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے۔ تجزیہ نگاروں میں عبادت بریلوی، عائشہ درانی، عابد علی عابد، ابوسعید بزمی اور خدیجہ مستور کے نام شامل ہیں۔ افسانے کی صف میں منٹو، ہاجرہ مسرور ڈاکٹر تاثیر اور قاسمی موجود ہیں۔ اُردو کے مستقبل کے حوالے سے ۹ اہل قلم نے اظہار خیال کیا ہے جبکہ اے قدوس نے 'قلم کے معیار' پر بحث کی ہے۔ نظم اور غزل میں وہ تمام نام ہیں جو اس دور کا چلن تھے۔ جوش، اختر الایمان، عدم، جاں نثار اختر، فراق، قتیل شفائی، عابد علی عابد، شاد عارفی، مختار صدیقی اور کئی دوسرے۔ جشن آزادی نمبر کے اداریے ''طلوع'' میں تلخی بھی ہے، غصہ بھی، ماضی کا جائزہ بھی ہے اور مستقبل کے عزائم بھی۔ ماضی کے زخم کریدتے ہوئے ہاجرہ مسرور نے لکھا:

> ''آزادی کا پہلا سال جمے ہوئے خون کی پپڑیوں میں لپٹا، لنگڑاتا اور کراہتا ماضی کے سرد اور مغموم اندھیرے میں ڈوب رہا ہے اور اب پاکستان آزادی کے دوسرے سال کا استقبال کر رہا ہے۔ ہمیں آپ کو اور سب کو یہ سال مبارک ہو۔۔۔۔ لیکن اس پُرمسرت موقعے پر بھی ہم دوسرے سال کے قہقہوں اور چہچہوں کے ساتھ اس کراہ کی طرف سے اپنے کانوں کو بہرا نہیں کر سکتے جو سرد اور مغموم ماضی کے کلیجے میں ہوک بن کر سما رہی ہے۔ ہماری مسرت سے ناچتی ہوئی نظریں جشن آزادی کے چراغاں سے اچٹ کر ادھر دیکھنے پر بھی مجبور ہیں جہاں بے گناہوں کے خون کی سرخی پر وقت کا ہاتھ کوئی دوسرا رنگ چڑھانے سے ہمیشہ قاصر رہے گا اور یہ سرخی ہماری تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ہمیشہ جھلملاتی رہے گی۔ پاکستان اور ہندوستان کی آئندہ نسلیں جب بھی اپنے ماضی کے اندھیرے میں تحقیق اور تفتیش کی مشعلیں لیے اتریں گی تو وہ آزادی کے پہلے سال کی کراہ کو زندہ پائیں گی اور اس کے سرخ پیرہن کو نیا۔۔۔ اور پھر وہ یقیناً ہمیں ''اگلے وقتوں کے لوگ'' کہہ کر ہمدردانہ طنز سے مسکرائیں گی اور مسکرانے کی بات تو ہے ہی۔ ہم نے فرنگی سامراج کے زیرسایہ ذلت سے بھرپور غلامی کی طویل سزا بھگت کر جب آزادی اور خودمختاری کی پہلی کرن دیکھی تو پاگلوں کی طرح اپنا ہی گھر اجاڑنے پر جٹ گئے۔ اپنا ہی جسم زخموں سے چور کر لیا، اپنی ان تمام اخلاقی اقدار کو مٹی میں ملا دیا جن کو محکومی کے دنوں میں بھی ہم اپنے سینے سے لگائے یک گونہ آسودگی محسوس کرتے

تھے اور آخر کار اولین جشن آزادی کو محرم کا وہ جلوس بنا دیا جس میں چھریوں اور زنجیروں کا ماتم ہوتا ہے۔'' (۳۹)

اداریے میں 'نیا سال'، 'اُردو'، جشن آزادی نمبر اور 'چغتائی کے تین شاہکار' کے ذیلی عنوانات کے تحت یہ تلخی بڑھتی جاتی ہے۔ آزادی کے اس ایک برس کو درج ذیل لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:

''فسادات وغیرہ سے قطع نظر یہ دیکھئے کہ ہم نے آزادی کے ایک سال میں کتنی ترقی کی۔

ملاحظہ ہو:

تعمیر ترقی۔　بڑی بڑی کوٹھیوں کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر۔۔اف بیچارے رفیوجیز!

سیاسی ترقی۔　وقت کے کسی بھی اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانے والا۔۔۔ففتھ کالمسٹ ہے!

سماجی ترقی۔　بغیر برقعہ کے باہر نکلنے والی عورت اسلام سے منحرف۔۔اس کی چوٹی کاٹ لو!

ادبی ترقی۔　ترقی پسند ادیب کمیونسٹ ہیں اور اس لیے پاکستان کے دشمن۔۔انہیں جیلوں میں ٹھونس دو! انا اللہ وانا الیہ راجعون۔'' (۴۰)

مستقبل کی توقعات کا اظہار ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

''ہمیں پاکستان کو ایک ایسا حریت پناہ ملک بنانا ہے جو خودداری اور خودنگری، بے تعصبی اور انسانیت پروری کا سچا علمبردار ہو۔ اور ہر قسم کے غیر ملکی اقتدار سے آزاد۔۔جس کے عوام صحیح معنی میں مطمئن، خوشحال اور تعلیم یافتہ ہوں اور یہ سب اس وقت ممکن ہے جب پاکستان کے ارباب اختیار ایسا نظام حکومت مرتب کریں جس کا عنوان مساوات انسانی ہو، جاگیرداروں، سرمایہ داری، طبقاتی تقسیم اور دفتری فرعونیت کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے اور پاکستانی عورت کو قانونی طور پر ہر طرح مرد کی برابری کا درجہ دیدیا جائے۔ یہی وہ تجاویز ہیں جنہیں قانون حیثیت دے کر حکومت پاکستان آزادی کے دوسرے سال کو تاریخ ایشیا کے ممتاز ترین اور روشن ترین سال کا درجہ دیدے گی بلکہ وہ اپنے ملک کی تمام داخلی بے اطمنانیوں کا خاتمہ کر کے کمال اطمینان سے یہ اعلان کر سکے گی کہ اب پاکستان تاریخ عالم کا ایک دوامی نقش ہے۔'' (۴۱)

نقوش کا عالمگیر امن نمبر اپنی طرز کی ایک غیر معمولی دستاویز ہے جو بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں منعقد ہونے والی عالمی امن کانفرنسوں اور ان کے پس منظر میں لکھی جانے والی نظموں غزلوں، افسانوں اور تجزیوں پر مشتمل ہے۔ چھ صفحات پر مبنی اداریے کا عنوان 'امن کی جنگ' معنویت سے بھرپور ہے۔

''پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، فن کاروں، صحافیوں اور دانش وروں کی طرف سے ''نقوش'' کا ''امن نمبر'' پاکستان کے بلکہ ساری دنیا کے ذہنی وجسمانی محنت کشوں کی

خدمت میں ایک پیغامِ عمل کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے امن نمبر کا خیال ہم کو اچانک آیا اور پھر اس کی تیاری کے لیے ہم کو صرف پندرہ دن مل سکے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کے مندرجات کے تنوع اور امن کے عالم گیر محاذ کی تفصیل کے مدِنظر اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا اور ہماری حکومت اور ہمارے عوام پاکستان کی طرف سے عالمگیر امن کی اس ہمہ گیر اور بھرپور آواز کو اس کی ایک زبردست مہم کی ابتدا سمجھتے ہوئے دنیا میں قیامِ امن کی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیں گے۔'' (۴۲)

نقوش کا ۸ واں شمارہ آزادی نمبر تھا، جو دوسرے یومِ آزادی کے موقع پر سامنے آیا۔۔۔گزشتہ ایک برس کے تلخ تجربات، تین رسالوں کی بندش اور رجعت پسندوں کے حملے اداریے کا موضوع بنے۔ ہاجرہ مسرور کے لفظوں میں:

''ان سب حملوں، سزاؤں، مخالفتوں اور شمنیوں کے مقابلے میں ترقی پسند ادیب چٹان کی طرح ڈٹے رہے ہیں۔ یہ ذاتی حملے ترقی پسندوں کو بدنام کرنے کی سازشیں اور یہ ذہنی عیاشیاں ہمیں ہمارے راستے سے نہیں ہٹا سکتیں۔۔ہمیں تو ان لوگوں پر رحم آتا ہے، جو اتنی پست سطح پر آگئے اور یہ ثابت کردیا کہ کمزور ہمیشہ گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ ترقی پسند رسالوں نے بھی ان تمام ہنگاموں میں بےحد استقلال اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ادبِ لطیف ہو یا سویرا، جاوید ہو یا سنگِ میل یا نقوش، ان سب رسالوں نے انتہا درجے کی پامردی سے ترقی پسند اقدار کی حمایت کی۔'' (۴۳)

اس شمارے میں عصمت کا قرۃ العین حیدر کے بارے میں خاکہ ''پوم پوم ڈارلنگ' خدیجہ مستور، انور، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی کے افسانے، احتشام حسین، ممتاز حسین، صفیہ اختر اور عبادت بریلوی کے مقالات اور جاں نثار اختر، فارغ بخاری، احمد ظفر، غلام ربانی تاباں، مخمور جالندھری، فراق گورکھپوری، معین احسن جذبی، ظہیر کاشمیری، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کے نظمیں غزلیں نمایاں تھیں۔

نقوش کے شمارہ ۹ میں احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند مصنفین پر ہونے والے اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا لیکن شاید انہیں اندازہ نہیں تھا کہ جلد ہی یہ اعتراضات ترقی پسندوں کے خلاف ایک چارج شیٹ میں بدل جائیں گے اور نقوش کی شریک مدیر ہاجرہ مسرور شمارہ نمبر ۱۰ کا اداریہ لکھ رہی تھیں تو انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ ان کا آخری اداریہ ثابت ہوگا۔ اس میں انہوں نے ۱۳۔۱۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہونے والی کل پاکستان ترقی پسند کانفرنس کی خبر دی تھی۔ اس کانفرنس کے فوراً بعد انجمن کو ایک سیاسی تنظیم قرار دے دیا گیا اور نقوش کے مدیران کو فوری رخصتی کا پروانہ مل گیا چنانچہ نقوش کا ۱۱ واں شمارہ نئے انتظامات کے تحت شائع ہوا۔ اسی شمارے میں عصمت چغتائی کا مضمون ''کدھر جائیں؟'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ''ترقی پسند تحریک'' تحریک پر

عبادت بریلوی کے مقالے کی نظریاتی کجرویوں پر بحث کی گئی تھی۔ غالباً انہیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ جس انتہا پسندی کا وہ مظاہرہ کر رہی ہیں اور جس انتہا پسندی کا مظاہرہ انجمن کی کل پاکستان کانفرنس میں ہونے جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں اور زیادہ مشکل دن آنے والے ہیں۔

نقوش کے اس شمارے میں نظموں، غزلوں، افسانوں اور مضامین کے علاوہ کئی اہم مستقل سلسلے بھی متعارف کروائے جن میں 'طلوع' (اداریہ) کچھ تو کہیے، میرے خیال میں (آراء) نئی کتابیں، نئے رسالے، مطالعے، جائزے، ہماری دنیا، ہمارے نام، ہماری تحریک، ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں (پاکستانی زبانوی سے تراجم) ہماری زبان، فلم اور ہمارا سماج قابل ذکر ہیں۔ ان سلسلوں نے قارئین، مصنفین اور مدیران کے درمیان قریبی اور گہرا تعلق قائم کر دیا جس سے ترقی پسند ادبی قدروں کو فروغ حاصل ہوا۔

آزادی کے بعد نکلنے والے ترقی پسند جرائد میں 'شاہراہ' کسی بھی طرح ادب لطیف، سویرا، نیا ادب، نقوش اور سنگ میل سے کم اہم ثابت نہیں ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ساحرلدھیانوی کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہی یہ جالندھر سے نکلنا شروع ہوا جس کا ذکر وضاحت کے ساتھ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ 'شاہراہ' کے ابتدائی دو شمارے ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ مشترکہ شمارہ نمبر ۴-۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہراہ ابتدا میں ہی مشکلات کا شکار ہو گیا تھا اور پھر چار ماہ کے تعطل کے بعد شمارہ ۳-۴ سامنے آیا۔ شاہراہ اپنے انداز اور مواد کے انتخاب سے 'سویرا' کے قریب تر لگا۔ ساحر 'سویرا' کو مرتب کرتے ہوئے ہندوستان گئے تھے لیکن جلد ہی وہ وہاں سے ممبئی چلے گئے اور ادارت براہ راست پرکاش پنڈت کے ہاتھ میں آ گئی۔ شاہراہ کے مختلف شماروں کے مندرجات پر نظر ڈالیں تو مقالوں، افسانوں اور منظومات کے علاوہ 'سویرا' اور نقوش کی طرح چند مستقل سلسلے بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں راہنما (اداریہ) نئے ادب کے معمار (ترقی پسند ادب کی کسی عالمی شخصیت کا پروفائل) رفتار (بین الاقوامی تہذیبی خبریں اور ادبی انتخاب) جائزے، پیغامات، سیف و قلم، رفتار عالم، گرد و پیش (کلچری سرگرمیاں) متفرقات، مکتوبات اور منزل بہ منزل قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۸-۵۱ء کے دوران پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں ترقی پسند ادیبوں نے خاصی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ قدم قدم پر ریاستی اور رجعتی تشدد اس کے علاوہ تھا جس کے نتیجے میں نقوش سمیت تمام ترقی پسند رسائل کو چند در چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

'شاہراہ' کے مصنفین کی اکثریت وہی تھی جو سویرا، نقوش سنگ میل اور ادب لطیف میں چھپ رہی تھی۔۔ تنقید و تحقیق میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، ممتاز حسین، سری نواس لاہوٹی، ہنس راج رہبر، قاضی عبدالغفار، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ڈاکٹر سلامت اللہ، کرشن چندر، ظہیر کاشمیری، وامق جونپوری، ایس اے ڈانگے، شکیل الرحمان 'ل' احمد، ظ انصاری، صاحبرہ زیدی، عبیدالحق اور سردار جعفری، افسانوں میں ملک راج آنند، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی، کشمیری لال ذاکر، غیاث احمد گدی،

کرتار سنگھ ، دگل، ڈاکٹر رشید جہاں، سہیل عظیم آبادی، جیلانی بانو، کرشن چندر، رضیہ سجاد ظہیر، بلونت گارگی، سرلا دیوی، پرکاش پنڈت، صدیقہ بیگم، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، علی عباس حسینی، فکر تونسوی، ذکی انور، اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ، نوتیج، فکر تونسوی، عصمت چغتائی، مانک ٹالا اور عزیز اثری، شاعروں میں جوش، فراق، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، نیاز حیدر، غلام ربانی تاباں، مخمور جالندھری، شاد عارفی، نیاز حیدر، سلام مچھلی شہری، احمد ریاض، جگن ناتھ آزاد، فارغ بخاری، جاں نثار اختر، اثر لکھنوی، خلیل الرحمان اعظمی، رفعت سروش، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، سید فیضی، ظہور نظر، سردار جعفری، احمد راہی، ابن انشا، افضل پرویز، جمیل ملک، حبیب جالب، باقر مہدی اور معین احسن جذبی کے نام شامل رہے ہیں۔

'شاہراہ 'میں پرکاش پنڈت زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے۔ ان کے بعد مخمور جالندھری نے ادارت سنبھالی۔ پرکاش پنڈت نے 'فنکار' کے نام سے ایک اور ترقی پسند ادبی مجلّہ ''فنکار'' نکالا۔ جس کا شمارہ ۴۔۳ ہمارے سامنے ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'فنکار' اپنے بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ۹۔۱۹۴۸ء میں کچھ اور شمارے بھی سامنے آئے جو اگرچہ باضابطہ طور پر انجمن ترقی پسند کے ترجمان نہیں تھے لیکن انہوں نے کسی نہ کسی حد تک ترقی پسند ادب کے تسلسل کو ضرور قائم رکھا۔ ممبئی سے پندرہ روزہ محاذ اور ماہنامہ 'علم و دانش ' جاری ہوئے۔ 'محاذ' انجمن ترقی پسند مصنفین ممبئی کا سرکاری ترجمان تھا جو ۱۵/اگست ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا۔ اس کے مستقل لکھنے والوں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی ، ملک راج آنند، راجندر سنگھ بیدی، ظ انصاری وشوا متر عادل، مہندر ناتھ اور پاک و ہند کے تمام ترقی پسند شعرا شامل تھے۔۔

ماہنامہ علم و دانش فروری ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا جو مارکسی علم و ادب کا ترجمان تھا۔ پندرہ روزہ ''شبنم'' کا اجراء رائل پارک لاہور سے ہوا۔ اسے نوجوان اور ترقی پسند نقاد ریاض جاوید نے جاری کیا۔ پہلے شمارے میں ممتاز حسین، طفیل احمد خان، عبداللہ ملک، حسن اعرافی اور عبدالرؤف ملک کے مضامین شامل تھے۔ مغربی شاعر ایذرا پاؤنو کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی عوام دشمنی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس کے چار صفحات مستقل طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے خبرنامے کے لیے وقف تھے۔ اسی طرح کراچی سے اُردو کی نامور اور ترقی پسند افسانہ نگار خدیجہ مستور نے ''رُوحِ ادب'' کے نام سے ایک ادبی ڈائجسٹ جاری کیا۔ اس کے دوسرے شمارے میں کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، اوپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، اختر شیرانی، قتیل شفائی، فراق گورکھپوری ، عدم، جگر مراد آبادی، ابراہیم جلیس، اختر حسین رائے پوری اور سجاد ظہیر کی نگارشات شامل تھیں۔ 'روحِ ادب' کے تیسرے شمارے میں مرزا رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کے مکمل متن کے علاوہ جدید ادب کے ساتھ ساتھ پرانے نادر شاہپارے بھی شامل کیے گئے تھے۔ اسی دور میں ''جاوید'' نے مختصر عرصہ کے لیے ترقی پسند ادب کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا۔ ادارتی ذمہ داریاں ظہیر کاشمیری، کشور یاسین، نصیر انور اور اے حمید کے سپرد تھیں۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''۱۹۴۸ء میں ترقی پسند تحریک کے ادباء سیاست، ادب اور معاشرت پر طغیانی انداز میں یلغار کر رہے تھے، ماہ نامہ ''جاوید'' کے مرتبین نے بھی ترقی پسند نظریات کے انتہا پسندانہ رویے کو قبول کیا اور اسی فکر و نظر کے مضامین کو فوقیت دی۔ کچھ عرصے کے بعد ادارے میں عارف عبدالمتین بھی شریک ہوگئے۔ ''جاوید'' کا چوتھا شمارہ اس کا خاص نمبر تھا اور اس میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' شائع ہوا جو سرکاری احتساب کی زد میں آ گیا اور پرچہ ضبط کرلیا گیا۔''(۴۴)

پابندی کے بعد ''جاوید'' جب دوبارہ نکلا تو اس میں وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ چند شماروں کے بعد یہ جانبر نہ ہوسکا اور بند ہوگیا۔ ''طلوع افکار'' ماہنامہ پاکستانی ادب اور سردار جعفری کا گفتگو (ممبئ) غیر رسمی طور پر ترقی پسند ادب کے فروغ میں اپنے اپنے طور پر کوشاں رہے لیکن یہ تنظیم کے سرکاری ترجمان نہیں تھے۔ اس لیے ان پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔

زیرِ نظر مطالعہ ترقی پسند ادب کی پون صدی (۲۰۱۱۔۱۹۳۶ء) کی ترجمان مجلّاتی صحافت کا مختصر جائزہ ہے۔ جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو لاہور سے 'ادب لطیف' نکل رہا تھا۔ اس نے (۳۹۔۱۹۳۸ء) سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھرپور ترجمانی کرنا شروع کر دی۔ بعد میں 'سویرا'، 'نیا ادب'، منظر عام پر آئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں 'نقوش'، 'سنگِ میل' اور 'شاہراہ' نے ترقی پسند تحریک کی ترجمانی کی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں ماہنامہ ''افکار''، ''گفتگو''، ''طلوع افکار''، جیسے مجلّے بھی بالواسطہ طور تحریک کے نظریاتی ترجمان رہے۔ تقسیم سے قبل ترقی پسند جرائد پر پابندیاں نہیں لگیں کیونکہ دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ اور سوویت یونین اتحادی بن چکے تھے اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے پابندیاں ہٹا لی گئی تھیں۔ لیکن پاک و ہند کی تقسیم کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے براہِ راست انقلاب کا نعرہ بلند کیا تو دونوں ملکوں میں حکومتوں نے جرائد کی ضبطی، مدیران کی گرفتاری اور جرمانے عائد کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تقسیم کے بعد سے ترقی پسند تحریک نے بھی انتہائی اقدام اٹھائے جیسے مخالف ادبی جماعتوں کے اہلِ قلم کی تحریروں کی اشاعت کا بائیکاٹ کرنا حتیٰ کہ منٹو جیسے بڑے افسانہ نگار تک اس انتہا پسندی کی زد میں آ گئے۔ بعد ازاں ترقی پسند مصنفین نے نئے منشور کے ذریعے معتدل راستہ اپناتے ہوئے اس انتہا پسندی کی اصلاح کی۔ پون صدی کی ترقی پسند مجلّاتی صحافت ان ادبی مباحث کا نچوڑ ہے جو تحریک کو داخلی اور خارجی دونوں صورتوں میں درپیش تھے۔

حواشی:

۱۔ اشارت ادب لطیف سالنامہ ۴۰۔۱۹۳۹ء
۲۔ اشارات ادب لطیف ،فروری ۱۹۴۲ء جلد ۱۴، شمارہ ۶ ،ص:۲
۳۔ ایضاً ص:۲
۴۔ اشارات ادب لطیف سالنامہ ۱۹۴۵ء ص: ۲۰
۵۔ حرف آغاز، دو ماہی 'نیا ادب' نمبر ۲، ۱۹۴۵ء بمبئی، ص: ۳
۶۔ ایضاً ص:۴
۷۔ حرف آغاز، ایضاً نمبر ۵ ، ۱۹۴۶ء، بمبئی، ص:۴
۸۔ ایضاً ص: ۸
۹۔ عارف عبدالمتین، ادب لطیف ، جوبلی نمبر ۱۹۶۳ء صفحہ نمبر ۲۹۲، مشمولہ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ، (اکادمی ادبیات پاکستان ، اسلام آباد، جنوری ۱۹۹۲ء) ص: ۱۰۷
۱۰۔ چودھری نذیر احمد، مجھے بھی کچھ کہنا ہے ''سویرا'' شمارہ ا، لاہور ۱۹۴۶ء ص: ۸
۱۱۔ ایضاً، ص: ۷
۱۲۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ،صفحہ نمبر ۱۰۷، ص: ۱۷۳
۱۳۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ترقی پسند ادب کے معمار، دہلی
۱۴۔ ''سویرا'' شمارہ ۷۔۸، نیا ادارہ لاہور، ص: ۲۴۸
۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۵۰
۱۶۔ احمد سلیم، سوانح عمری حمید اختر ، لاہور ۲۰۱۰، ص: ۱۴۲
۱۷۔ ''سویرا'' شمارہ ۶۔۵، لاہور، ص: ۵
۱۸۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۹ ، لاہور، ص: ۶
۱۹۔ ایضاً، شمارہ ۱۴۔۱۳، ص: ۵۔۴
۲۰۔ ایضاً، ص: ۶
۲۱۔ ایضاً، نمبر ۱۶۔۱۵، ص: ۶
۲۲۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۱۶۔۱۵، ص: ۹
۲۳۔ شگفتہ حسین، ڈاکٹر، ماہنامہ ادب لطیف کی ادبی خدمات ، (بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان)، صفحہ نمبر ۳۳، مشمولہ ''ادب لطیف''

۲۴۔ ایضاً
۲۵۔ اداریہ ماہنامہ ادب لطیف' مارچ ۱۹۴۹ء، لاہور ص:۴
۲۶۔ ایضاً، ص: ۷۔۵
۲۷۔ ایضاً سالنامہ ۱۹۵۰، ص: ۵
۲۸۔ ''نیا ادب''، اکتوبر ۱۹۴۸ء جلد ۱۰، شمارہ ۳، بمبئی، ص: ۵
۲۹۔ ایضاً
۳۰۔ ''نیا ادب''، بمبئی
۳۱۔ پریت لڑی، پریت نگر، ستمبر ۱۹۴۲ء، ص:۸
۳۲۔ سنگ میل، محلّہ خدا داد پشاور، شمارہ نمبر ا، ۱۹۴۸ء، ص: ۷
۳۳۔ ایضاً، ص: ۱۰
۳۴۔ ایضاً شمارہ نمبر ۴، ص: ۹
۳۵۔ ایضاً
۳۶۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۹، ص:۴
۳۷۔ ماہنامہ 'نقوش' لاہور شمارہ نمبر ا، ۱۹۴۸ء، ص:۴
۳۸۔ ایضاً، ص: ۵
۳۹۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۴، ۱۹۴۸ء ص:۴
۴۰۔ ایضاً، ص: ۵
۴۱۔ ایضاً ص: ۶۔۵
۴۲۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۷، ص: ۸
۴۳۔ ایضاً، شمارہ نمبر ۸، ص: ۵
۴۴۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص: ۱۴۵

مآخذ:

۱۔ اداریہ ماہنامہ ادب لطیف' مارچ ۱۹۴۹ء، لاہور۔
۲۔ اشارت ادب لطیف سالنامہ ۴۰۔۱۹۳۹ء۔
۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جنوری ۱۹۹۲ء۔

۴۔ حرف آغاز، دو ماہی 'نیا ادب' نمبر۲، بمبئی، ۱۹۴۵ء۔

۵۔ سنگ میل، محلّہ خداداد پشاور، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۴۸ء۔

۶۔ شگفتہ حسین، ڈاکٹر، ماہنامہ ادب لطیف کی ادبی خدمات، ملتان: بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی۔

۷۔ عبدالمتین، عارف، ادب لطیف، جوبلی نمبر ۱۹۶۳ء صفحہ نمبر ۲۹۲، مشمولہ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جنوری ۱۹۹۲ء۔

۸۔ ماہنامہ 'نقوش' لاہور شمارہ نمبر ۱، ۱۹۴۸ء۔

۹۔ نذیر احمد، چودھری، مجھے بھی کچھ کہنا ہے ''سویرا'' شمارہ ۱، لاہور ۱۹۴۶ء۔

۱۰۔ ''سویرا'' شمارہ ۷۔۸، نیا ادارہ لاہور۔

☆☆☆